قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1962ء

اسلامی نظامِ مملکت کی خصوصیات

اس میں

(۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، یکساں عزت کا مستحق ہوگا (۱۷/۷۰)۔

(۲) معاشرہ میں مدارج کا معیار، کردار کی بلندی اور حسنِ عمل ہوگا (۴۹/۱۳)۔

(۳) تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی — روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ — کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی (۶/۱۵۲ : ۲۰/۱۱۸)۔

(۴) ہر ایک سے عدل ہوگا — حتٰکہ دشمن سے بھی۔ اور جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائیگی، اسکی کمی کو پورا کیا جائیگا (۵۳/۳۹ : ۵/۸)۔

(۵) فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں تمام نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال کیا جائیگا (۲۲/۶۵ : ۴۵/۱۳)۔

(۶) ہر معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔ کوئی فرد نہ کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا، نہ محتاج (۳/۷۸ : ۶/۵۷)۔

طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی نظام کے قائم کرنے کا داعی ہے

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک
ہندوپاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوپاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
خط وکتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

(جلد ۱۵) اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء (نمبر ۱۰)

فہرستِ مضامین

لمعات ——— ۲
حضرت عائشہؓ کی عمر (بوقت نکاح) — محترم پرویز صاحب ——— ۱۱
رابطہ باہمی ——— ۲۳
جدید میکیاولی سیاست ——— ۲۵
عائلی قوانین پر اعتراضات اور انکے جواب — محترم نصیر شاہ صاحب و رفیع اللہ صاحب اختر ۴۹
احتساب ——— ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارے ہاں فکر و عمل کا جو اضطراب انگیز اور مایوس کن انتشار پایا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے ہماری کشتی ایک قدم بھی ساحل مقصود کی طرف بڑھتے نہیں پاتی، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اہل پاکستان کے ذہن میں دین اور مذہب کا فرق واضح نہیں۔ یہ ابہام، قوم کے جاہل طبقہ تک ہی محدود نہیں۔ اس کا تصور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں بھی واضح نہیں۔ الا ماشاء اللہ ــــ جن لوگوں کے ذہن میں یہ فرق واضح تھا وہ رفتہ رفتہ دنیا سے چلے جا رہے ہیں اور آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت جس نہج سے ہو رہی ہے، اس میں اس تصور کی اہمیت ہی کا کسی کو احساس نہیں۔ حالانکہ یہی وہ تصور ہے جس کی بنا پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ یہی وہ دلیل تھی جس کے زور پر ہم نے اس "مقدمہ" کو جیتا۔ اور یہی مقصد تھا جس کے لئے ہم نے اپنی الگ مملکت قائم کی۔ اسی کو پاکستان کی آئیڈیالوجی کہتے ہیں، اور یہی آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں اور کوئی شخص متعین طور پر بتا نہیں سکتا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا اور کیوں حاصل کیا تھا۔ اور یہ بات صاف ہی نہیں ہو سکتی جب تک دین اور مذہب کا فرق واضح طور پر سامنے نہ آجائے۔

مذہب سے مراد ہے انسان اور خدا کا پرائیوٹ تعلق۔ اور اس کا منتہیٰ اور مقصود ہے نجات حاصل کرنا اس کے لئے ہر مذہب نے پوجا پاٹ، بھگتی اور پرستش کے کچھ طریقے تجویز کر رکھے ہیں اور ان کی ادائیگی کے لئے چند ایک رسومات مقرر ہیں۔ جو شخص ان طریقوں کے مطابق ایشور کی پوجا یا خدا کی پرستش کر لیتا ہے، وہ مذہب کا فریضہ ادا کر دیتا ہے۔ اس سے وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اور خدا کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ ہر فرد یہ سب کچھ انفرادی طور پر کرتا ہے۔ اگر یہ پوجا پاٹ یا پرستش کہیں اکٹھے ہو کر کی جاتی ہے تو بھی اس کا مقصد انفرادی نجات ہی

ہوتا ہے کسی اجتماعی مقصد کا حصول نہیں ہوتا۔

اس سے واضح ہے کہ مذہب یکسر انفرادی چیز ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک ہندو صبح کے وقت مندر میں جاکر یا اپنے کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے خیال اور طریقے کے مطابق ایشور کی بھگتی کرلے، ایک پارسی شام کے وقت لیمپ یا آگ روشن کرکے اس کے سامنے ڈنڈوت بجالائے یا ایک عیسائی گرجا میں جاکر یا اپنے گھر میں موم بتیاں جلاکر (حضرت) مسیحؑ یا (حضرت) مریمؑ کے مجسمے کے سامنے (یا ویسے ہی) اپنا سر جھکا دے۔ تو مذہب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ باقی رہے دنیاوی امور، سو انہیں اپنی مصلحت اور صوابدید کے مطابق جس طرح جی چاہے سرانجام دے لیا جائے۔ مذہب کو اس سے سروکار نہیں ہوتا۔

لیکن دین کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ دین ایک نظام حیات کا نام ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ وہ ایسی حدود متعین کرتا ہے جس سے وہ فرد یا قوم، جو اس دین کو اختیار کرتی ہے کسی حالت میں بھی تجاوز نہیں کرسکتی۔ وہ ایک ضابطہ، اصول و قوانین دیتا ہے جس کے مطابق اس قوم کو اپنی زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ یہ اصول اور قوانین تمام نوع انسان کے لئے یکساں طور پر دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے دنیا کا جو انسان انہیں تسلیم کرلے (ان پر ایمان لے آئے) وہ بلا لحاظ خون۔ رنگ۔ زبان۔ نسل۔ وطن ـــ اس قوم مسلم کا فرد بن جاتا ہے۔ جو انہیں تسلیم نہیں کرتا وہ دوسری قوم کا فرد شمار کیا جاتا ہے۔

چونکہ قانون اسی صورت میں قانون کی شکل اختیار کرسکتا ہے جب وہ عملی طور پر نافذ ہو اور یہ صرف ایک آزاد مملکت میں ہی ممکن ہے اس لئے دین کو عملی صورت اختیار کرنے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر دین، دین ہی نہیں بن سکتا۔

دین اور مذہب کے اس بنیادی فرق کو ایک مثال سے سمجھئے۔ انگلستان عیسائیوں کا ملک ہے۔ وہاں کا سربراہ سلطنت (بادشاہ ہو یا ملکہ) مذہب کا محافظ ("DEFENDER OF THE FAITH") کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کی حکومت "سیکولر" ہے۔ سیکولر حکومت اسے کہتے ہیں جس میں مذہب دخل انداز نہ ہو۔ وہاں کے عیسائی باشندے گرجا میں جاکر اپنا مذہبی فریضہ ادا کر لیتے ہیں اور جب امور مملکت طے کرتے ہیں تو اس میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہوتا وہ جس طرح کا جی چاہے قانون بنالیں جب جی چاہے اس میں رد و بدل کرلیں۔ یا اس کی جگہ دوسرا قانون نافذ کردیں۔

یہی کیفیت ہندوستان میں ہے ـــ اور ایک انگلستان اور ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے۔ اس وقت ساری دنیا کا یہی چلن ہے۔

اس کے برعکس دین کو لیجئے ــــ اس کی مثال کے لئے ہمیں تیرہ سو سال پیچھے جانا پڑے گا جب دنیا میں دین کی بنیادوں پر مملکت قائم ہوئی تھی۔ اسے اسلامی حکومت کہا جاتا ہے اس حکومت میں صورت یہ نہیں تھی کہ نماز تو ایک خاص طریق کے مطابق ادا کی جائے اور قوانین جس طرح جی چاہے مرتب کر لئے جائیں۔ اس میں وحی کی رُو سے کچھ قوانین و احکام دیئے گئے تھے جن کی پابندی لازمی تھی اور جہاں تفصیلی احکام نہیں دیے گئے تھے وہاں ان احکام کو مرتب کرنے کے لئے اصول دیئے گئے تھے، جن سے کسی صورت میں بھی انحراف یا تجاوز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ ہے مذہب اور دین کا بنیادی فرق۔ اس فرق کو اگر ہم مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ

> مذہب میں مذہب اور سیاست الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن دین میں، یہ دونوں ایک ہی ہوتے ہیں ان میں دوئی نہیں ہوتی ــــ جونہی "قیصر اور خدا" الگ الگ ہوئے حکومت سیکولر ہو گئی اور دین مذہب بن کر رہ گیا۔ اس کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے جہاں کہا ہے کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴) جو اپنے معاملات کے فیصلے وحی منزل من اللہ (قرآن مجید) کے مطابق نہیں کرتے وہی کو کافر کہتے ہیں۔

یورپ کے سامنے چونکہ دین کا تصور نہیں تھا اسلئے انھوں نے اسلام کو بھی ایک مذہب قرار دیکر اس کا ترجمہ (RELIGION) کر دیا۔ اور چونکہ مسلمانوں کے ذہن سے بھی دین کا تصور اوجھل ہو چکا تھا انھوں نے بھی اس ترجمہ (RELIGION) کو قبول کر لیا اور اسطرح اسلام جو ایک دین تھا مذہب بنکر رہ گیا۔ اسلام کے متعلق اس تباہ کن غلطی کی طرف سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے توجہ دلائی اور وہ عمر بھر اس حقیقت کو واضح کرتے رہے کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ اور مذہب اور دین میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہی وہ فرق تھا جس کی بنا پر انھوں نے آج سے قریب پچاس سال پہلے اعلان کیا کہ ہندوستان میں بسنے والے ہندو اور مسلمان محض اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مسلمان اپنے دین کی بنا پر ایک الگ قوم کے افراد ہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو انھوں نے اس پیغام کو عام کیا کہ چونکہ اسلام دین ہے اور دین عملی شکل میں آنے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین چاہتا ہے اس لئے یہاں کے مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت ہونی ناگزیر ہے۔ جب قائداعظمؒ نے اس حقیقت کو ایک سیاسی مطالبہ کی شکل میں پیش کیا تو سب سے پہلے ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام ایک مذہب (RELIGION) ہے۔ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اس وقت ہم اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ ہندوؤں کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت محض سیاسی مصالح کی بنا پر ہوئی تھی یا وہ ــــ اقبال اور جناح کے بار بار سمجھانے کے باوجود ــــ مذہب اور دین کے اس فرق

کو سچ مچ نہیں سمجھتے تھے ـــــ ہندوؤں کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت کسی وجہ سے ہوئی ہو، یہ امر بڑا تاسف انگیز تھا کہ اس کی مخالفت خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے بھی ہوئی اور یہ کہہ کر ہوئی کہ اسلام ایک مذہب ہے مذہب کو سیاست سے کیا سروکار ہے اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ ایسا کہنے والوں میں علمائے کرام کا طبقہ پیش پیش تھا۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کے متعلق علامہ اقبالؒ کو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بصد حسرت و یاس کہنا پڑا تھا کہ، ؏

چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

وہیں ایک اور جماعت بھی تھی جو اسے تو تسلیم کرتی تھی کہ مسلمان اپنے دین کی بنا پر ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مطالبہ پاکستان کی وہ بھی سخت مخالف تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پہلے پکا اور سچا مسلمان بننا چاہیئے اور پھر ان پکے اور سچے مسلمانوں کو اپنی الگ حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ گویا ان کے نزدیک بھی، ایک شخص غیر مسلم حکومت کے تابع رہتا ہوا "پکا اور سچا" مسلمان ہو سکتا تھا۔ وہ لاکھ سمجھانے سے بھی یہ بات نہیں سمجھتے تھے ـــــ یا سمجھنا چاہتے نہیں تھے۔ کہ اگر ایک غیر مسلم حکومت کی محکومی میں ایک قوم پکی اور سچی مسلمان بن سکتی ہے تو پھر اس قوم کو الگ حکومت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اُسے تو حکومت چاہیئے ہی اس لئے تھی کہ وہ پکی اور سچی مسلمان بن جائے۔ اور جب یہ مقصد اپنی حکومت سے پہلے ہی حاصل ہو سکتا ہے تو پھر اپنی حکومت کس غرض کے لئے قائم کی جائے گی! بہرحال، وجہ کچھ بھی ہو، یہ جماعت بھی مطالبۂ پاکستان کے سخت مخالف تھی۔

لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں نے اپنے اس دعوے کو تسلیم کرا لیا کہ اسلام ایک دین (نظامِ حیات) ہے جو مسلمانوں کی آزاد مملکت میں ہی بروئے کار آسکتا ہے۔ یہ مذہب نہیں جو ہر انداز حکومت میں زندہ اور آزاد رہ سکتا ہے۔ مسلمانوں کے اس دعوے کو تسلیم کر لینے کا نتیجہ یہ تھا کہ پاکستان ایک آزاد، جداگانہ مملکت کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آگیا۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک (بطور فخر نہیں بلکہ بطور تحدیث نعمت ذکر کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں طلوعِ اسلام ایک ایسا آرگن تھا جو قرآن کریم اور اسوۂ نبی اکرمؐ کی روشنی میں اس حقیقت کو نمایاں کرتا تھا کہ ہندوستان میں اسلام کو زندہ دین بننے کے لئے آزاد مملکت کی ضرورت ہے)۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کیا ہے اور کس طرح اس آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کے استحکام کے ساتھ مملکت پاکستان کا استحکام وابستہ ہے۔ جس قدر اس آئیڈیالوجی کی صداقت کا یقین پختہ ہو جائے گا اسی قدر پاکستان کی سالمیت محکم ہوگی۔ جس قدر یہ یقین کمزور ہوتا جائے گا

اسی نسبت سے پاکستان کی بنیاد کمزور ہوتی جائے گی۔

تشکیل پاکستان کے بعد، وہ قومیت پرست (نیشنلسٹ) مسلمان یہاں موجود تھے جو پاکستان کی آئیڈیالوجی کی مخالفت کرتے تھے۔ نیز اس قسم کے اکثر مسلمان، خود ہندوستان سے ترک وطن کرکے پاکستان آگئے۔ یہ حضرات یہاں پاکستان کے پُرامن شہریوں کی طرح رہتے ہیں اور اب ان میں اور ان مسلمانوں میں جو نظریۂ پاکستان کے حامی تھے، کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں اب بھی کچھ لوگ ایسے ہوں جو پاکستان کی آئیڈیالوجی کو بدستور غلط سمجھتے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی مملکت میں جس کا وجود ہی ایک آئیڈیالوجی کا رہین منت ہو، ایسے لوگوں کی موجودگی جو اس آئیڈیالوجی کو غلط سمجھتے ہوں، اس مملکت کی کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ کسی کے دل میں جھانکنا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو اس آئیڈیالوجی کے خلاف کچھ کہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے کہ اس قسم کے خیالات کی نشر و اشاعت، اس مملکت کے خلاف غداری ہے۔

ان مسلمانوں کے علاوہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتیں بھی ہیں جو پاکستان کی اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہیں کرتیں۔ ان کے ہاں مذہب انسان کا ایک نجی معاملہ ہے جسے سیاست اور ریاست سے کوئی سروکار نہیں۔ مملکت پاکستان ان غیر مسلم اقلیتوں کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ قرآن کریم کا تو یہاں تک حکم ہے کہ اگر ان غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کو کوئی اور بھی نقصان پہنچانا چاہے تو مسلمان سینہ سپر ہوکر ان کی حفاظت کریں۔ اس باب میں اسلام غیر مسلموں کو وہ حقوق دیتا ہے جو انہیں کسی سیکولر اسٹیٹ میں بھی حکمران طبقہ کے مقابلہ میں اقلیت کی حیثیت سے بمشکل حاصل ہوسکتے ہیں۔ (ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ میں، مسلمانوں کی حالت اس کی زندہ مثال ہے) لیکن اس کے باوجود یہ ظاہر ہے کہ ان غیر مسلموں کو بھی اس نظریہ کی تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ مذہب اور سیاست دو الگ چیزیں ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا، پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کردینے کے مترادف ہوگا۔

پاکستان میں مؤثر غیر مسلم اقلیتیں، ہندو اور عیسائی ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت مشرقی پاکستان میں ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ہندو منظم طور پر اپنے مذہب کی اشاعت نہیں کرتے۔ لیکن عیسائیوں کی کیفیت ان سے مختلف ہے۔ ان کے بڑے بڑے منظم ادارے ہیں، جو تعلیم اور تبلیغ، دونوں طریقوں سے اپنے مذہب کی اشاعت کرتے ہیں ــــ یہ ادارے ایسے منظم ہیں کہ مسلمانوں کی اس اپنی مملکت میں کوئی مسلم ادارہ شاید ہی ایسا منظم ہو۔ ان عیسائی مشنری اداروں کے زیر نظم و ضبط، ملک میں درسگاہوں ــ اسکولوں اور کالجوں ــ کا ایک

جال بچھا ہوا ہے اور چونکہ ان میں تعلیم کا معیار، پاکستانی درسگاہوں کے مقابلہ میں بالعموم بلند ہے، اس لئے قوم کے بچوں کا بہترین طبقہ مشنریوں کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ان درسگاہوں کے جاذب اور مقبول ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں داخلے کے لئے انتظار کرنے والوں کی لمبی چوڑی فہرستیں آویزاں رہتی ہیں اور جس شخص کے بچوں اور بچیوں کو ان میں داخلہ مل جاتا ہے وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے۔ ان درسگاہوں میں عیسائیت کی تعلیم کس حد تک دی جاتی ہے اس سے بردست ہمیں بحث نہیں۔ ہم اس وقت صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی جس آئیڈیالوجی کا اوپر ذکر کیا جا رہا تھا اس تعلیم کا اس پر کیا اثر پڑتا ہے۔

وہ کون ہے جسے اس کا علم نہیں کہ عیسائیت کا بنیادی تصورِ زندگی یہ ہے کہ ــــ قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور خدا کا خدا کو۔ یعنی اس میں مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہے ان کی ساری تعلیم روح اور مادہ۔ دنیا اور آخرت۔ مذہب اور سیاست کی علیحدگی کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ اپنی درسگاہوں میں عیسائیت کی براہ راست تعلیم دیں یا نہ دیں، وہ اس بنیادی آئیڈیالوجی کو اپنی فکر سے الگ کر نہیں سکتے ــ اور یہ واضح ہے کہ یہ آئیڈیالوجی پاکستان کی آئیڈیالوجی کی یکسر نقیض ہے۔ یہ وہی آئیڈیالوجی ہے جس کے خلاف دس برس تک مسلسل جنگ کے بعد ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ اب آپ سوچئے کہ جو بچے ان درسگاہوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلیں جہاں کی فضا اس "نقیضِ پاکستان آئیڈیالوجی" سے معمور ہو، ان بچوں کے قلب و دماغ کی کیفیت کیا ہو گی؟ انہیں اس آئیڈیالوجی سے کچھ لگاؤ ہی نہیں ہو گا جو مملکتِ پاکستان کی اصل و بنیاد ہے ــ نہیں! وہ اس آئیڈیالوجی کو یا تو "مذہبی ملاؤں" کا خوابِ پریشاں قرار دیں گے اور یا مسٹر جناح کا "سیاسی حربہ" جس سے اس نے پاکستان کی لڑائی جیتی تھی۔ ہم یہ کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے۔ ہمیں آئے دن ایسے نوجوان طالب علموں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے جو ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ــ یا وہاں کے فارغ التحصیل ہوتے ہیں ــ جو بات ہی یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ مذہب کو بھلا سیاست سے کیا واسطہ؟ حتیٰ کہ ان میں بعض ایسے بے باک بھی ہوتے ہیں جو بلا دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ تقسیمِ ہند حماقت تھی۔ پاکستان میں مسلسل پندرہ برس سے یہ روش جاری ہے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ایسے طالب العلم ان درسگاہوں سے نکلتے ہیں جو پاکستان کی آئیڈیالوجی کو مذاق سمجھتے ہیں۔ قوم کا سن رسیدہ عنصر جس نے پاکستان کی لڑائی لڑی تھی یا جو اس لڑائی کا عینی شاہد تھا آہستہ آہستہ اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ اور ان کی جگہ یہ نوجوان، قوم کا حصہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد ملتِ پاکستانیہ خالصۃً انہی نوجوانوں پر مشتمل ہو گی۔ یعنی یہاں وہ قوم آباد ہو گی جو اس آئیڈیالوجی سے متنفر کر دی گئی جس پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ عیسائی مشنریز دیدہ و دانستہ ایسا کچھ کرتے ہیں۔ یا یہ غیر شعوری طور پر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یعنی وہ جان بوجھ کر پاکستان میں ایسی نسل پیدا کرنا چاہتے ہیں جن کے دماغ، پاکستانی آئیڈیالوجی کے خلاف بغاوت کے جراثیم سے بھرپور ہوں۔ یا یہ نسل از خود ان کی تعلیم گاہوں میں تیار ہو رہی ہے اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن بحث ختم کرنے کے لئے ہم مانے لیتے ہیں کہ وہ ایسا کچھ دیدہ و دانستہ نہیں کرتے لیکن اس سے اس نقصانِ عظیم کی تلافی تو نہیں ہو جاتی جو مملکت پاکستان کو ان کی تعلیم و تبلیغ سے پہنچ رہا ہے، وہ خطرہ بہرنوع دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ ایسا کچھ دیدہ و دانستہ کرتے ہوں یا نادانستہ، ہمارے لئے یکساں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر اس رَو کو بند نہ کیا گیا تو کچھ عرصہ بعد خود ہمارا اپنا (INTELLIGENTSIA) ہماری مملکت کی بنیادوں کی دیمک بن جائے گا۔

اس رَو کو بند کرنے کے سوال کے ساتھ ہی ہمارے سامنے وہ اعتراض آجاتا ہے۔ جو اس سلسلے میں اکثر گوشوں سے سننے میں آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل ہے اس لئے جو نظریہ عیسائیت کے مذہب کا جزو، بلکہ اس کی اصل و بنیاد ہو اس کی تبلیغ و تعلیم کو روکا کس طرح جا سکتا ہے؟ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق صحیح پوزیشن اچھی طرح سے سمجھ لی جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں غیر مسلموں کو مذہبی آزادی حاصل ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی مذہب کا کوئی نظریہ، ہماری مملکت کی اصل و بنیاد کے خلاف جاتا ہو تو کیا اس مذہب کے پیروؤں کو کھلی چھٹی ہو گی کہ وہ اس نظریہ کو جس قدر جی چاہے پھیلائیں کیونکہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان تو ایک طرف، اس قسم کی "مذہبی آزادی" دنیا کی کوئی مملکت بھی نہیں دے سکتی۔ اس لئے ہمیں یہ متعین کرنا ہو گا کہ مذہبی آزادی کا بالآخر مفہوم کیا ہے؟

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مذہب ان عقائد اور رسومات پر مشتمل ہوتا ہے جس میں سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کسی مذہب کے کسی نظریہ کا اثر اس ملک کی سیاست پر پڑتا ہو تو اس ملک کے نقطۂ نگاہ سے وہ نظریہ مذہبی نہیں رہتا، سیاسی ہو جاتا ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ اس نظریہ کی تعلیم و تبلیغ کی اجازت دی جائے یا نہ، اس ملک کے سیاسی مصالح پر مبنی ہو گا۔ اگر اس ملک کی سیاست اس قسم کی تعلیم و تبلیغ کو اپنے لئے نقصان رساں سمجھے تو وہ اسے روک دینے کی مجاز ہو گی اور اس کے خلاف یہ اعتراض معقول نہیں سمجھا جائے گا کہ اس حکومت کا یہ فیصلہ "مذہبی آزادی" کے منافی ہے۔

اس بنا پر اگر حکومت پاکستان کسی ایسے نظریہ کی تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہ دے جو اس آئیڈیالوجی کے خلاف

جائے جس پر مملکت پاکستان کی عمارت استوار ہے۔ تو اس کا یہ فیصلہ "مذہبی آزادی" کے خلاف نہیں قرار پا سکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس خطرہ کی روک تھام کا طریق کیا ہے۔ طریق یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو عیسائی مشنریوں کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے سے قانوناً روک دیا جائے۔ طریق تو یہ موثر بھی ہے اور آسان بھی۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور اقدام نہایت ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ عیسائی مشنریوں کی درسگاہوں کی تعلیم و تربیت کا معیار اتنا بلند ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو ان درسگاہوں میں داخل کرانے کے لئے بیحد کوشاں رہتے ہیں اور جسے داخلہ مل جائے وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی سیاسی (بلکہ یوں کہئے کہ دینی) شعور اتنا پیدا نہیں کہ لوگ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو اس شدید خطرہ سے بچانے کے لئے، اس پر بطیب خاطر آمادہ ہو جائیں کہ وہ مشنری درسگاہوں کی بلند معیار کی تعلیم پر اپنے درسگاہوں کی نسبتاً کم معیار کی تعلیم کو ترجیح دیں۔ اس لئے ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں کی تعلیم و تربیت کو اتنا بلند کر دیں کہ لوگ ان کی طرف کھنچے کھنچے چلے آئیں۔ یوں بھی کیا یہ امر ہمارے لئے باعث تاسف اور ندامت نہیں کہ غیر ملکوں کے ادارے ہمارے یہاں آکر تعلیم کا معیار اس قدر بلند رکھیں اور ہم اپنے گھر میں پست معیار پر قانع ہو جائیں۔ یہ ہماری ملی غیرت کے چہرے پر ذلت آمیز چپت ہے۔ اس لئے ہمیں بنیادی طور پر اپنی درسگاہوں کے معیار تعلیم کو بلند کرنا چاہیئے۔

اپنی درسگاہوں کا ذکر آ جائے تو اس سے ہماری حالت وہی ہوتی ہے جو محو رقص طاؤس کی، اپنے پاؤں پر نظر پڑ جانے سے ہو جاتی ہے۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں اس تشویش انگیز حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ عیسائی اداروں میں ایسے نظریہ کی تعلیم دی جاتی ہے جو پاکستان آئیڈیالوجی کے یکسر خلاف جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری درسگاہوں میں وہ کون سی تعلیم دی جاتی ہے جس سے پاکستانی آئیڈیالوجی کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ان میں ابھی تک اس نہج کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی داغ بیل انگریز نے ڈالی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں "اسلامیات" کا اضافہ ہوا ہے لیکن جو کچھ اسلامیات میں پڑھایا جاتا ہے کیا اس سے پاکستان آئیڈیالوجی پر یقین محکم ہو جاتا ہے؟ قطعاً نہیں یہ اس قسم کی تعلیم ہے جس قسم کی تعلیم ان دارالعلوموں میں دی جاتی تھی۔ (اور دی جاتی ہے۔) جہاں کے علمائے کرام، پاکستان آئیڈیالوجی کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ اس تعلیم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی ان اصلاحات سے کچھ مفید مطلب نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جو تعلیمی کمیٹی کی سفارشات کی بنیادوں پر جاری کی جا رہی ہیں۔ یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی تعلیم کے پورے نظام کو اس طرح بدلیں کہ ہم اپنے بچوں کو تاریخ جغرافیہ۔ ریاضیات۔ معاشیات۔ عمرانیات۔ سائنس، غرضیکہ ـــــ جو کچھ بھی پڑھائیں، اس کی رگوں میں، غیر شعوری طور پر، پاکستان آئیڈیالوجی (یعنی یہ حقیقت کہ اسلام میں، دین اور

دنیا میں کوئی ثنویت اور مغایرت ہیں) رواں دواں جاری ہو اور جب ہمارے بچے ان درسگاہوں سے باہر آئیں تو مختلف دنیاوی علوم کے علمبردار ہونے کے ساتھ، وہ اس آئیڈیالوجی کو اپنی زندگی کی اصل و بنیاد سمجھیں اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو محض عیسائی مشنریوں کی درسگاہوں میں اپنے بچوں کے داخلے پر پابندی لگا دینے سے مقصد پیش نظر حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہم اہل پاکستان نے تعلیم کے مسئلہ کی طرف سے جو مجرمانہ تغافل برتا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل سے اپنی جداگانہ ہستی کے جواز اور وجوب کا احساس گم ہو رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ اور اسی طرح جاری رہا، تو یہاں اس آئیڈیالوجی کا تصور ہی ناپید ہو جائے گا جس پر مملکت پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے ـــ اور اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

خدا کرے کہ ہمارے ہاں کے سیاست کے علمبرداروں اور دین کے اجارہ داروں کی سمجھ میں یہ نکتہ آجائے کہ اگر مملکت کی بنیاد ہی کھوکھلی ہو گئی تو حکومت کی وہ کرسیاں کہاں رہیں گی جن کی چھینا جھپٹی کے کھیل کو وہ اپنی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ بنائے ہوئے ہیں؟ اس لئے قومی مفاد سے قطع نظر، خود ان کے ذاتی مفاد کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم کو ایسے نہج پر ڈالیں جس سے وہ "دین اور دنیا" دونوں کو ایک ہی ذات میں سمو لیں، اور اس کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ملک سے اسکولوں اور مکتبوں ـــ اور کالجوں اور دارالعلوموں کا امتیاز ختم کر کے، اپنی درسگاہوں میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس سے "مسٹروں" اور "مولویوں" کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے۔ یاد رکھئے! جب تک ہم ایسا نہیں کرتے، مسلمان بچوں پر مشنریوں کی درسگاہوں کے دروازے بند کر دینے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ "خدا اور قیصر" کی ثنویت کے زندہ مظاہر تو خود ہمارے الگ الگ کالج اور دارالعلوم ہیں، اور ملک گزشتہ ۱۵ سال سے جس انتشار کا شکار ہو رہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ثنویت ہے (اس نکتہ کی وضاحت کسی دوسری صحبت میں کی جائے گی)

حضرت عائشہؓ کی عمر

بوقتِ نکاح

[قرآن کریم نے نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا ہے لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ مصر ہے کہ نکاح نابالغ کا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے حق میں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔ محترم پرویز صاحب نے اس واقعہ کی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور اٹھارہ سال کے درمیان تھی۔ ان کا یہ تحقیقاتی مقالہ پہلے، طلوع اسلام کی نومبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد ان کی تصنیف "طاہرہ کے نام خطوط" جلد دوم میں شامل کر لیا گیا تھا۔ چونکہ آج کل عائلی قوانین کے سلسلے میں اس موضوع نے پھر اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے قارئین کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس مضمون کو طلوع اسلام میں دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس تمام دوران میں پرویز صاحب کی اس تحقیق کی تردید میں کسی گوشے سے کوئی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری۔ اس کی تائید ضرور ہوئی ہے۔ یہ امر باعث صد مسرت ہے کہ اس تحقیق سے ہماری تاریخ کی ایک ایسی غلطی کا ازالہ ہو گیا جس کی وجہ سے غیر مسلموں کو حضور نبی اکرمؐ کی ذات اطہر و اقدس کے خلاف زبان کھولنے کا موقع مل جاتا تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ طلوع اسلام]

ہمارے ہاں جو باتیں متفقہ طور پر مانی جاتی ہیں۔ یعنی جن میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس کی اور رخصتی کے وقت نو برس کی تھی۔ اس بات کو ایک ایسے مسلمہ کے طور پر مانا جاتا ہے کہ اس میں کسی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس کی بنیاد ان روایات پر ہے جو

بخاری۔ طبری۔ اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں ملتی ہیں لیکن انہی اور ان جیسی تاریخ کی اور کتابوں میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے اس بات کی تردید ہوتی ہے اور اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر اس سے کہیں زیادہ تھی۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق کریں۔ دو ایک باتیں تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہیں۔ پہلے تو یہ کہ قرآن کریم میں نکاح و طلاق وغیرہ سے متعلق احکام ہجرت کے بہت بعد نازل ہوئے تھے اور حضرت عائشہؓ کے نکاح اور رخصتی کے واقعات چونکہ ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے سال کے بیان کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ قرآنی احکام کے نزول سے پہلے کی باتیں ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا' عربوں میں شادی سے پہلے رشتہ کے متعلق بات طے کر لینے کا رواج تھا۔ یہ وہی چیز تھی جسے ہمارے ہاں نسبت ٹھہرانا یا منگنی کرنا کہتے ہیں۔ قرآن میں صرف نکاح کا ذکر ہے۔ نسبت اور منگنی کا نہیں۔ لہٰذا روایات میں جو کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا اور رخصتی نو برس کی عمر میں۔ تو وہاں نکاح سے مقصود' عربی معاشرہ کی رسم کے مطابق رشتہ کی بات چیت کا طے پانا (یا منگنی کرنا) ہے۔ اور رخصتی سے مراد شادی۔ بنابریں اصل سوال یہ ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر کیا تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں عربوں کے ہاں کوئی خاص کیلنڈر رائج نہیں تھا جس کی رو سے وہ واقعات کا تعین اسی طرح کرتے جس طرح ہم آج تاریخ۔ دن۔ مہینہ اور سن لکھ کر تعین کرتے ہیں۔ (سنہ ہجری پہلے پہل حضرت عمرؓ کے زمانہ میں رائج ہوا تھا) ان کے ہاں پیدائش اور موت کے زمانے کا تعین بعض اہم واقعات کی نسبت سے کرتے یا دوسرے بچوں کی پیدائش وغیرہ کی نسبت سے۔ خود ہمارے ہاں بھی بڑی بوڑھیاں عمروں کا تعین اسی طرح سے کرتی ہیں۔ مثلاً وہ کہیں گی کہ جب کانگڑے کا بھونچال آیا ہے تو زید دودھ پیتا تھا اور عمر' زید سے تین سال بعد پیدا ہوا تھا۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضورؐ کی پیدائش عام الفیل میں ہوئی تھی۔ یعنی اس سال جب یمن کے گورنر نے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب واقعات کا تعین اس طرح سے کیا جائے تو ان میں مہینوں کا اور بعض اوقات برسوں کا فرق بھی کچھ مستبعد نہیں ہو سکتا۔ (اس کی مثالیں آخر میں پیش کی جائیں گی) دوسرے یہ کہ پیدائش کے واقعات میں اگر مہینہ نہ دیا جائے صرف سال ہی دیا جائے تو عمر کے حساب میں کم و بیش ایک برس کا فرق ویسے ہی پڑ سکتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی تو اگر اس کی پیدائش جنوری کے مہینے میں ہوئی تھی تو ۱۹۲۰ء کا سال عمر کے حساب میں شامل کرنا چاہیئے۔ اور اگر پیدائش دسمبر میں ہوئی تھی تو عمر کی ابتدا ۱۹۲۱ء

سے ہونی چاہیئے۔ لہٰذا ہماری تاریخ میں عمروں کے حساب کے لئے اس بنیادی نقطہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

تیسرے یہ کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ہمارے ہاں سن کی باقاعدہ ترویج حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی اور اس کی ابتدا ہجرت سے کی گئی۔ اگرچہ ہجرت ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی تھی لیکن سنہ ہجری کو محرم سے شمار کر کے پورا سال لے لیا گیا۔ ہجرت سے پہلے سن کا تعین نبی اکرمؐ کی نبوت کے سال سے کیا جاتا ہے (اگرچہ روایات مختلف ہیں لیکن) اسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جب حضورؐ عمر کے چالیسویں سال میں تھے تو آپ کو نبوت عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد تیرہ سال تک آپ مکہ میں رہے۔ پھر ہجرت کی۔ یعنی ہجرت کے وقت آپ اپنی عمر کے ۵۳ سال پورے کر چکے تھے اور ۵۴ واں سال شروع تھا۔ اس اعتبار سے اگر اس سال کو شامل کر لیا جائے۔ جب آپ کو نبوت عطا ہوئی تھی۔ یعنی عمر کا چالیسواں سال تو) ہجرت کے وقت نبوت کا پندرھواں سال ہوگا۔ اور اگر اس پہلے سال کو شامل نہ کیا جائے تو نبوت کا چودھواں سال۔ ان نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کا اثر مسئلہ زیر نظر پر پڑے گا۔

---

(۱) اسد الغابہ جلد چہارم صفحہ ۳۷۷ پر مذکور ہے کہ

حضرت فاطمہؓ۔ حضرت عائشہؓ سے تقریباً ۵ سال بڑی تھیں۔

لہٰذا حضرت عائشہؓ کا سن پیدائش معلوم کرنے کے لئے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ حضرت فاطمہؓ کا سالِ پیدائش کیا تھا۔

(۲) اسد الغابہ ہی میں ہے کہ

حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کے ہاں گئے تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے کہہ رہی تھیں کہ میری عمر تم سے زیادہ ہے۔ تو اس پر حضرت عباسؓ نے کہا کہ فاطمہؓ اس زمانہ میں پیدا ہوئی تھیں جب قریش خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور علیؓ اس سے چند سال پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ (جلد چہارم صفحہ ۲۵۰)

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر ہے کہ

حضرت فاطمہؓ کی پیدائش اس سال ہوئی تھی جب کہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اور نبی اکرمؐ کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔

(جلد چہارم صفحہ ۳۷۷)

طبقات ابن سعد میں ہے۔

حضرت فاطمہؓ رسول اللہؐ کی بیٹی ہیں۔ ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ہیں۔ حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ان دنوں پیدا ہوئی تھیں جب قریش بیت اللہ کی تعمیر کر رہے اور یہ واقعہ نبوت سے ۵ سال پہلے کا ہے۔

(جلد ۸ صـ ۱۱)

دوسری جگہ ہے۔

حضرت عباسؓ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے گھر گئے۔ تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ سے فرما رہی تھیں کہ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا دیکھو فاطمہؓ! تم ان دنوں پیدا ہوئی تھی جب کہ قریش خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور نبی اکرمؐ کی ۳۵ سال کی عمر تھی۔ اور دیکھو علیؓ! تم اس سے چند سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

(جلد ۸ صفحہ ۱۷)

استیعاب میں حضرت فاطمہؓ کی وفات کے متعلق حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

وفات کے وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر کیا تھی۔ اس میں اختلاف ہے۔ زبیر بن بکار نے عبداللہ بن الحسن سے نقل کیا ہے کہ وہ ہشام بن عبدالملک کے پاس تھے اور وہاں کلبی بھی موجود تھے۔ ہشام نے عبداللہ بن الحسن سے دریافت کیا کہ اے ابو محمدؐ! فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ کی عمر کل کتنی ہوئی تھی تو عبداللہ ابن الحسن نے کہا کہ تیس سال اس کے بعد ہشام نے کلبی سے دریافت کیا کہ حضرت فاطمہؓ کی کل عمر کتنی ہوئی تو کلبی نے کہا ۳۵ سال۔ اس پر ہشام نے عبداللہ بن الحسن سے کہا کہ اے ابو محمدؐ! سنئے۔ کلبی کیا کہہ رہے ہیں۔ اور ہشام نے کلبی کے بیان کو زیادہ اہمیت[1] دی۔ اس پر عبداللہ بن الحسن نے کہا۔ اے امیرالمومنین! مجھ سے میری ماں کے متعلق پوچھئے اور کلبی سے اس کی ماں کے متعلق دریافت کیجئے۔ (جلد ۲ صفحہ ۷۵۲)

حضرت فاطمہؓ کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی تھی۔ اگر اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی تو اس سے

---

[1] آخر میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی پیدائش نبوت سے قریب پانچ سال پہلے ٹھیک بیٹھتی ہے۔ (مہینوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔)
اس میں شبہ نہیں کہ (دیگر واقعات کی طرح) حضرت فاطمہؓ کی عمر (بوقت وفات) کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کی رُو سے ان کی عمر ۲۴ سال کی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک کی رو سے ۱۸ سال سے کچھ زیادہ۔ لیکن صحیح یہی نظر آتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر قریب ۳۰ سال تھی اور پیدائش نبوت سے قریب پانچ سال پہلے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سال پیدا ہوئیں جب نبی اکرمؐ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں تھے (حضرت فاطمہؓ کی پیدائش سے قریب پانچ سال بعد) یعنی اس سال جب حضورؐ کو نبوت ملی (آخر میں ایک اور روایت بھی دیکھئے)

(۳) اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح (منگنی) کے وقت ۶ برس کی تھی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کی پیدائش سنہ نبوی میں (یعنی حضورؐ کو نبوت ملنے کے چوتھے سال۔ یا جب حضورؐ کی عمر ۴۴ سال کی تھی (اس وقت) ہوئی تھی۔ اس لئے کہ نکاح (منگنی) کا واقعہ سنہ نبوی بتایا جاتا ہے یعنی جب حضورؐ کی عمر پچاس سال کی تھی۔ یہ بات بوجوہ غلط ہے۔ مثلاً طبقات ابن سعد میں ہے کہ

> جب رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عائشہؓ کا پیغام دیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں عائشہؓ کے متعلق مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف کے اس کے بیٹے جبیر کے لئے وعدہ یا بات چیت کر چکا ہوں۔ لہٰذا مجھے مہلت دیجئے کہ میں عائشہؓ کو ان سے واپس لے لوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسا ہی کیا۔
>
> (جلد ۸ صفحہ ۳۹)

اگر حضرت عائشہؓ کی عمر اس واقعہ کے وقت چھ برس کی تسلیم کی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جبیر سے ان کی منگنی چار پانچ سال کی عمر میں ہو چکی تھی۔ عربوں میں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی کہ وہ چار چار پانچ سال کی عمر کی لڑکیوں کی نسبت کر دیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں بخاری میں ہے کہ

> حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب نبی اکرمؐ پر مکہ میں بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ۔ (سورہ القمر) آیات نازل ہوئیں تو میں ان دنوں بچی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی۔
>
> (بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۰)

سورہ قمر قریب سنہ ۵ نبوی میں نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کم از کم اتنی تو ہونی چاہیئے کہ انھیں معلوم ہو کہ یہ قرآن کی آیات ہیں۔ اور بعد میں یہ واقعہ یاد بھی رہے۔ اگر ان کا سال پیدائش سنہ ۴ نبوی تصور کر لیا جائے تو سنہ ۵ میں وہ ایک سال کی ہوئیں ۔ ایک سال کی بچی کے لئے نہ کھیلنا پھرنا ممکن ہے نہ قرآنی آیات کے متعلق یہ کچھ یاد رکھنا ممکن۔ اس کے برعکس اگر ان کا سن پیدائش نبوت کا پہلا سال تسلیم کیا جائے تو سورہ قمر کے نزول کے وقت ان کی عمر پانچ چھ سال کی ہوگی۔ اس عمر میں وہ یقیناً کھیلتی پھرتی ہوں گی۔ اور قرآنی آیات کے متعلق یہ کچھ یاد رکھنے کے قابل۔ (اس ضمن میں وہ روایت بھی قابل غور ہے جو آخر میں درج کی گئی ہے۔)

ان شہادات سے واضح ہے کہ یہی روایت قابل ترجیح ہے کہ ان کی پیدائش اسی سال ہوئی جب رسول اللہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں تھے۔

---

(۴) جس واقعہ کو نکاح یا منگنی سے تعبیر کیا گیا ہے وہ شوال سنہ ۱۰ نبوی میں ہوا تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۸ ص ۳۹) جب حضورؐ کی عمر پچاس کی تھی اس اعتبار سے حضرت عائشہ کی عمر اس وقت دس سال کے قریب تھی۔ اگر پہلا سال شمار نہ کیا جائے اور گیارہ سال کی اگر اسے شمار کر لیا جائے۔ چونکہ اصل اہمیت شادی کے واقعہ کو ہے نہ کہ منگنی کے واقعہ کو۔ اس لئے ہم اس واقعہ کے سرسری تذکرہ کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔

---

(۵) شادی کے متعلق اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ ہجرت کے بعد ہوئی تھی۔ سو ہمیں پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ہجرت کب ہوئی تھی۔

نزول وحی کے بعد نبی اکرمؐ مکہ میں کتنے سال رہے۔ اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوئی ہے تو آپ کی ۴۰ سال کی تھی اور اس کے بعد آپ دس سال تک مکہ میں رہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ۔

> ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ رسول اللہؐ پر دس برس مکے میں اور دس برس مدینے میں وحی نازل کی گئی۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ کون کہتا ہے۔ مکہ میں آپ پر پندرہ برس تک یا اس سے زیادہ وحی کی گئی۔

لیکن انہی (حضرت عباسؓ) سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ مکہ میں تیرہ برس رہے۔ چنانچہ اس بات کو عام طور پر

تسلیم کیا گیا ہے کہ آپ تیرہ برس مکہ میں رہے۔ اس کے بعد ہجرت فرمائی۔ (ان روایات کے لئے دیکھئے طبقات ابن سعد جزو اول۔ صفحہ ۲۲۴ - ۲۳۳ ۔ تاریخ طبری۔ جلد اول حصہ سوم صفحہ ۵۴ (صفحہ ۳۶ و ۱۲۵) اتفاق سے اس وقت میرے سامنے ان جلدوں کا وہ اردو ترجمہ ہے جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ اس لئے یہ دونوں حوالے اس کے ہیں) تیرہ سال اور پندرہ سال کے تضاد کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ رسول اللہ اپنی عمر کے ۵۲ سال پورے کر چکے تھے اور ۵۳ واں سال شروع ہوا تھا۔ جب ہجرت ہوئی اور حضور چالیسویں سال میں تھے کہ نزول وحی کی ابتدا ہوئی۔ اب اگر عمر کا چالیسواں سال شمار نہ کیا جائے تو مکہ کا قیام ۱۲ برس کا ہوتا ہے اور چودھویں برس کے شروع میں ہجرت ہوتی ہے۔ اور اگر چالیسویں سال کو شمار کر لیا جائے تو مکہ کا قیام چودہ سال کا ہوتا ہے۔ اور پندرہویں سال میں ہجرت ہوتی ہے۔ اسی کو غالباً حضرت عباسؓ کی روایت میں پندرہ سال کہہ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عائشہؓ شروع ہجرت میں یا تو ۱۳ سال پورے کر کے چودھویں سال میں تھیں اور یا چودہ سال پورے کر کے پندرھویں سال میں (نیز دیکھئے وہ روایت جو آخر میں آئی ہے)۔

---

(۶) اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہجرت کے کتنے عرصے بعد آپ کی شادی ہوئی۔ عام روایت کے مطابق۔ نکاح (منگنی) کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ برس کی تھی اور (رخصتی) شادی کے وقت نو برس کی اور رخصتی مدینہ میں شوال کے مہینے میں ہوئی تھی۔ چونکہ منگنی ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اس لئے اس روایت کے مطابق آپ کی شادی ہجرت کے پہلے سال ماہِ شوال میں ہو جانی چاہیئے لیکن یہ بھی غلط ہے۔ اس کے وجوہات حسب ذیل ہیں۔

(ا) طبقات ابن سعد میں حضرت عائشہؓ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جب نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ مدینہ تشریف لے گئے تو حضورؐ کی صاحبزادیاں اور حضرت ابوبکرؓ کے اہل و عیال مکہ میں پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ چنانچہ اس کے بعد جب آپ کو اطمینان ہو گیا تو ان سب کو مدینہ بلوایا گیا۔ (طبقات جلد ۸ صفحہ ۴۳)

(ب) بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ۔

جب ہم مدینہ آئے تو مجھے وہاں بخار آیا اور میرے سر کے تمام بال جھڑ گئے۔ اس کے بعد وہ پھر اُگ آئے اور کندھوں تک آ گئے تب آپ کی شادی ہوئی۔

(بخاری جزو ۲ صفحہ ۲۰۴)

اس سے ظاہر ہے کہ

(i) حضرت عائشہؓ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد تک مکہ ہی میں رہیں (واضح رہے کہ ہجرت ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی تھی۔

(ii) مدینہ تشریف لانے کے بعد آپ بیمار ہوئیں اور آپ کے سر کے بال سب جھڑ گئے۔

(iii) اس کے بعد وہ تمام بال دوبارہ اُگے اور کندھوں تک آ گئے۔ اس کے بعد آپ کی شادی ہوئی۔

اگر یہ مانا جائے کہ آپ کی شادی ہجرت کے پہلے سال شوال میں ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اوپر کے تمام واقعات آٹھ ماہ کے اندر اندر (ربیع الاول سے شوال تک) ہو گئے تھے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ آپ کو ہجرت کے بعد مکہ سے مدینہ آنے میں تین چار ماہ کا عرصہ لگا۔ پھر ایک آدھ مہینہ بیماری کا بھی سمجھ لیجئے تو اس کے بعد شادی تک کے لئے تین چار ماہ کا عرصہ باقی رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں کسی صورت میں بھی نئے بال اُگ کر کندھوں تک نہیں آ سکتے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ بخاری کے شارح عینی نے بھی لکھا ہے کہ

> یہ قول بہت ہی عجیب ہے کہ ان کی رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوگئی۔ یہ قول بالکل کمزور ہے۔ ان کی رخصتی جنگ بدر سے واپسی کے بعد شوال سنہ ۲ ہجری میں ہوئی۔ (عینی جلد ۲ صفحہ ۹۶)

(ج) اس کی تائید استیعاب نے بھی کی ہے جس میں لکھا ہے کہ

> رسول اللہؐ نے ہجرت سے تین سال پہلے شوال سنہ ۱۰ نبوی میں حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تھا اور ہجرت سے ۱۸ ماہ بعد شوال میں مدینے میں انہیں رخصت کرا کر لائے تھے۔ (استیعاب جلد ۲ صفحہ ۷۴۴)

(د) اسد الغابہ میں ہے کہ

> حضرت فاطمہؓ کی شادی۔ حضرت عائشہؓ کی شادی کے چار ماہ بعد ہوئی تھی۔
> (جلد ۴ صفحہ ۳۷۷)

حضرت فاطمہؓ کی شادی محرم میں ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس سن ہجری کا محرم تھا۔ بخاری میں ایک طویل روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میری ایک اونٹنی تھی جو مجھے یوم بدر میں مال غنیمت میں ملی تھی۔ اور ایک اونٹنی مجھے رسول اللہ نے اس حصہ میں سے دی تھی جو اللہ نے آپ کو بطور فے دیا تھا۔ یعنی خمس میں سے۔ میں نے ارادہ کیا کہ حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہ کو رخصت کرا کر لے آؤں۔ اور میں نے بنو قینقاع کے ایک سنار سے بات چیت کی کہ وہ میرے ساتھ چلے اور ہم چل کر اذخر گھاس لے آئیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اذخر گھاس کو سناروں کے ہاتھ فروخت کروں گا۔ اور اس سے جو رقم مجھے حاصل ہوگی اس سے شادی کا ولیمہ کروں گا۔ (اس کے بعد ہے کہ حضرت حمزہؓ نے کس طرح ان اونٹنیوں کی کوکھیں پھاڑ ڈالیں۔ چونکہ یہ حصہ ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے اس لئے اسے نقل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔) (بخاری جزو سوم صفحہ ۸)

اس سے ظاہر ہے کہ جنگ بدر تک حضرت علیؓ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جنگ بدر رمضان سنہ ۲ھ میں ہوئی لہٰذا آپ کی شادی جلدی سے جلدی سنہ ۳ھ کے محرم میں ہو سکتی ہے۔ (اسد الغابہ میں اسے غلطی سے محرم سنہ ۲ھ لکھ دیا گیا ہے)

اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی شادی اس سے چار ماہ قبل ہوئی تھی۔ اس لئے یہ شادی شوال سنہ ۲ھ میں ہو سکتی ہے نہ کہ سنہ ۱ھ میں۔

(۷) تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پندرہ برس کی تھی، اگر سال پیدائش کو شمار نہ کیا جائے اور سولہ برس کی اگر اس سال کو شمار کر لیا جائے یعنی ہجرت کے وقت کی عمر سے قریب دو سال زیادہ۔

حضرت عباسؓ کی یہ روایت پہلے درج کی جا چکی ہے کہ حضورؐ نزول وحی کے بعد پندرہ سال تک مکہ میں رہے۔ اس مقام پر ہم نے تیرہ اور پندرہ سال کی روایات میں مطابقت کی کوشش کی تھی لیکن اگر اس روایت کو بالفاظہٖ صحیح مان لیا جائے (کہ حضورؐ نے مکہ میں کامل پندرہ سال رہنے کے بعد سولہویں برس میں ہجرت کی) تو اس صورت میں حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت شادی سترہ سال کی ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کی تائید طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ

ابن عباسؓ اور ابن حنظلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے پینسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (طبری اردو ترجمہ حیدر آباد۔ جلد اول۔ حصہ سوم صفحہ ۵۹۹)

یعنی چالیس سال کی عمر میں نبوت - پندرہ سال مکہ میں - اور دس سال مدینہ میں کل پینٹھ سال -

---

ان شہادات کے علاوہ ایک اور شہادت ایسی ہے جو واقعہ کے لحاظ سے ان سے بھی قوی ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ (۱۷) سال کی . فلہذا رخصتی کے وقت قریب انیس (۱۹) سال کی تھی - حضرت اسمأ بنت حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کی بڑی (علاتی) بہن تھیں - ان کے متعلق صاحب مشکوٰۃ ، شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب اپنی کتاب اکمال فی اسماء الرجال ، میں لکھتے ہیں کہ .

> یہ اسمأر ہیں ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی - ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے - کیونکہ انھوں نے جس رات میں حضورؐ نے ہجرت کی تھی اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے - اس کے ایک حصہ میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزہ پر باندھا یا اس کا اپنا پٹکا بنا لیا تھا - اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ہیں - مکہ میں اسلام لائیں - کہا جاتا ہے کہ اس وقت صرف سترہ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا - اور یہ حضرت عائشہؓ سے دس برس بڑی تھیں - جب آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی نعش کو (جو بعد قتل ایک لکڑی پر لٹکا دی گئی تھی) لکڑی سے اتار کر دفن کیا گیا - اس سے دس دن بعد یا بیس دن بعد بعمر ایک سو سال انتقال کیا - اس وقت ۷۳ھ تھا - ان سے بہت سے لوگوں نے احادیث کی روایت کی ہے .
>
> (اکمال مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے اس کا صفحہ ۴۷۲ دیکھئے -)

حضرت اسمأر کی عمر بوقت وفات (۷۳ھ میں) سو سال کی تھی - اس سے ظاہر ہے کہ ان کی عمر ہجرت کے وقت ستائیس (۲۷ سال) کی تھی - اور چونکہ حضرت عائشہؓ ان سے دس سال چھوٹی تھیں - اس لئے حضرت عائشہؓ کی عمر ۱۷ سال کی تھی - اس اعتبار سے شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر قریب انیس سال کی ہوتی ہے -

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کلبی نے جو ہشام بن عبدالملک سے کہا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر قریب پینتیس سال کی تھی تو یہ قرین قیاس ہے - اگر حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ سال کی تھی تو حضرت فاطمہؓ کی عمر اس وقت قریب بائیس سال کے ہوگی اور وفات کے وقت قریب ۳۳ سال - اور پیدائش

اور وفات کے سال ساتھ شمار کر لینے سے ۲۵ سال۔

بہرحال تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بعض روایات کے مطابق انیس برس اور بعض کے مطابق ۱۷ برس کی تھی اور ۱۵-۱۶ برس سے کم کسی صورت میں بھی نہ تھی۔ اس لئے وہ روایات کہ شادی کے وقت آپ کی عمر ۹ برس کی تھی۔ آپ اس وقت بچیوں کے ساتھ جھولے جھولتیں اور نبی اکرمؐ کے ہاں آجانے کے بعد بھی گڑیاں کھیلا کرتی تھیں قابلِ قبول قرار نہیں پاسکتیں۔ رسول اللہ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں ان میں سے کسی کی شادی بھی صغیر سنی میں نہیں کی۔ سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کی شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر کم از کم ۲۱ یا ۲۲ سال کی تھی۔ حالانکہ حضرت علیؓ جن سے ان کی شادی کرنی تھی خود گھر میں موجود تھے۔

آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں تاریخ کے متعلق ایک بار پھر اس اہم نکتہ کو دہراؤں جسے اس سے پیشتر کئی مرتبہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ہمیں ایک ہی واقعہ کے متعلق کئی متضاد روایات ملتی ہیں۔ مثلاً طبری میں خود نبی اکرمؐ کی عمر کے متعلق یہ روایات موجود ہیں کہ آپ کی عمر ۶۰ سال کی۔ تریسٹھ سال کی یا پینسٹھ سال کی تھی (طبری جلد اول حصہ سوم) یا مثلاً حضرت فاطمہؓ کے وفات کے متعلق ہے کہ وہ حضورؐ کی وفات کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں۔ یا ایک ماہ۔ دو ماہ۔ تین ماہ اور پانچ دن۔ چار ماہ اور بعض کے نزدیک چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ (بحوالہ سیرۃ النبی شبلی جلد دوم ص۴۲۶ حاشیہ) یہ فرق تو پھر بھی چند دنوں اور مہینوں کا ہے۔ حضرت سودہؓ کی وفات کے متعلق واقدی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ۵۴ھ میں وفات پائی۔ اور امام بخاری تاریخ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال فرمایا۔ (یعنی ۲۳ھ سے پہلے) اس فرق کو ملاحظہ کیجئے کہ کس قدر زیادہ ہے۔ یہ تضاد جہاں تک ان واقعات میں ہو جن کا تعلق کسی دینی معاملہ سے نہیں اور نہ ہی ان کا اثر نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس پر پڑتا ہے۔ ان میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ایک روایت کو قبول کر لیا جائے یا دوسری کو۔ مثلاً یہ کہ حضرت سودہؓ کی وفات ۲۳ھ میں ہوئی تھی یا ۵۴ھ میں۔ اس کا اثر نہ دین پر پڑتا ہے نہ رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس پر۔ لیکن ایسی روایات جن کا اثر دین یا حضورؐ کی ذات پر پڑتا ہو۔ ان کے متعلق بڑی احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے بارے میں اصول یہ ہونا چاہیئے کہ

سلہ بحوالہ سیرۃ النبی شبلی جلد دوم ص۴۰۲

کوئی بات جو قرآن کے خلاف ہے یا جس سے حضورؐ کی ذات کے خلاف کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے وہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتی۔ خواہ تاریخی اسناد کی رُو سے وہ کتنی ہی ثقہ کیوں نہ قرار پا چکی ہو۔ تاریخ بہرحال ظنی ہے اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے اور یہ حقیقت بھی قطعاً یقینی ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل نہ قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے اور نہ ہی شرفِ انسانیت کے خلاف۔ اس لئے ہمیں ظنی چیزوں کو ہمیشہ یقینی باتوں کے تابع رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنی تاریخ میں اتنی احتیاط برت لیں تو ہم دین کے معاملہ میں بہت سی الجھنوں سے بچ جائیں گے، اور سیرتِ نبی اکرمؐ کے بارے میں ان رنجدہ اعتراضات سے جو ہماری تاریخی روایات کی بنا پر غیروں کی طرف سے آئے دن عاید ہوتے رہتے ہیں۔ ضرورت، تو اس امر کی ہے کہ صدر اول کی تاریخ مذکورہ بالا معیار کے مطابق از سرِ نو لکھی جائے۔ تاکہ جن غلط واقعات کی بنا پر نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہو جاتی ہے وہ واقعات تاریخ میں باقی نہ رہیں۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے اس وقت تک ہمیں اتنا ضرور کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی روایات کے متعلق کہہ دیا جائے کہ یہ غلط ہیں اور مزید تحقیق کی محتاج۔

مُفت

مجرب دوا برائے :- دمہ - درد گردہ و پتھری - سخت کمزوری اور سستی

ملنے کا پتہ :-

حاجی محمد دین - شیخ آئس فیکٹری

متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ کراچی

نوٹ :- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

رابطۂ باہمی

بزمہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

کوئٹہ ادارہ کی طرف سے شمارہ اگست میں شائع شدہ ہدایات کے مطابق اہلِ فکر و نظر طبقہ تک تحریک کا پیغام اور لٹریچر پہنچانے کی کوششیں جاری ہیں۔ چنانچہ کوئٹہ کی حالیہ نمائش میں یہ ذمہ داری نمائندہ بزم نے خود اپنے ہاتھوں سرانجام دی اور بزم کے طے شدہ فیصلے کے مطابق "اسبابِ زوالِ امت" کی زیادہ سے تعداد تقسیم کی گئی۔ جشنِ کوئٹہ کی ان تقریبات میں قرآنی تحریک کی اشاعت و تبلیغ کے سلسلے میں محترم طاہر ابرار انصاری، محمد فاروق صاحب میمن اور محترم قدیر احمد خان صاحب نے بالخصوص سرگرمی سے حصہ لیا۔۔۔

لغات القرآن اور مفہوم القرآن کا درس بدستور جاری ہے۔ بزم کی ان سرگرم مساعی سے غلط پروپیگنڈے اور شکوک و شبہات کے پردے چاک ہو رہے ہیں۔

نمائش کے زنانہ شو میں "عورت کی مظلومی" پمفلٹ تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا اور اپنے اثرات کے اعتبار سے بیحد کامیاب رہا۔

چونڈہ (ضلع سیالکوٹ) اراکینِ بزم قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اپنی استطاعت سے بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ہر شام کو مفہوم القرآن کے درس کے لئے مجلس آراستہ ہوتی ہے جس میں اراکینِ بزم کے علاوہ دیگر حضرات بھی شریک ہوتے ہیں۔ مفکرِ قرآن کی اہم مطبوعات اہلِ علم میں برائے مطالعہ تقسیم کر رکھی ہیں اور وہ ان کے مطالعہ سے گہرا اثر قبول کر رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے شمارے بھی مطالعہ کے لئے مہیا کئے جاتے ہیں۔

بورے والہ (ضلع ملتان) بزم کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں اور ان میں مفہوم القرآن کا درس جاری ہے۔ "عائلی قوانین" اور "نذرِ عقیدت" کے پمفلٹ نہ صرف قصبہ میں تقسیم کئے گئے۔ بلکہ مضافات کے اہلِ فکر اصحاب کے نام بذریعہ ڈاک [illegible] "عائلی قوانین" کے مدلل اور مفصل مقدمہ نے اہلِ علم طبقہ کو پہلی بار اس حقیقت سے متعارف کیا کہ مروجہ عائلی قوانین کے خلاف جو شور و شر برپا ہے علم و بصیرت کی روشنی میں وہ کس حد تک جذباتی نعروں پر مشتمل ہے

پشاور بزم کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں۔ ان اجتماعات میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔ بزم پشاور صدر کے زیرِ اہتمام بھی درسِ قرآن کے یہ ٹیپ، قلب و نگاہ کو شادابیاں عطا کرتے ہیں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی یہ مساعی بڑے خوشگوار اثرات کی آئینہ دار ثابت ہو رہی ہیں۔

مردان نمائندہ بزم اپنی طویل بیماری (عارضہ قلب) کے باعث چار پانچ ماہ باہر رہے۔ ان کی واپسی پر بزم ایک نیا عزم لے کر آگے بڑھی ہے۔ قرآن کریم کا درس باقاعدگی سے شروع ہے۔ "عائلی قوانین" اور "نذرِ عقیدت" کے پمفلٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ "اسبابِ زوالِ امت" کے ایک صد نسخے اہلِ علم و فکر حضرات کو مہیا کئے گئے ہیں۔ ۲۸ ستمبر کو ڈاکٹر رضا محمد خان کی قیام گاہ پر درسِ قرآن کا ٹیپ سنایا گیا جسے بے حد پسند کیا گیا۔

لاہور چھاؤنی میں نئی بزم کا قیام

بزم طلوع اسلام کے قیام کے سلسلے میں ۱۶ اگست کو مقامی احباب کا پہلا اجتماع ہوا۔ محترم ظفر عباس صاحب قریشی اور چوہدری محمد اشرف صاحب نے قرآنی فکر کی اشاعت و تبلیغ کی اہمیت واضح کی۔ اور بتایا کہ پاکستان، اسلام اور انسانیت کے بہترین مفاد کے لئے قرآنی فکر کو منظم طور پر آگے بڑھانے کی بڑی ضرورت ہے تاکہ نوعِ انسانی موجودہ مشکلات سے نجات پا کر، اس جنتِ ارضی سے مالامال ہو سکے جس کا قرآن داعی ہے اور جس کا حسین ترین نقشہ حضور رسالت مآب والذین معہ کے مقدس ہاتھوں تشکیل پایا۔ چوہدری محمد اشرف صاحب متفقہ طور پر بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ اتوار کو بزم کے دفتر کا افتتاح عمل میں لایا جائے۔ بزم نے یہاں کی دو مقامی لائبریریوں کے نام طلوع اسلام کے اجراء کا بھی فیصلہ کیا اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ اجتماعات میں زیادہ سے زیادہ اہلِ علم اصحاب کو شرکت کی دعوت دی جائے۔

نئی بزموں کے قیام کی توثیق

ادارہ لاہور چھاؤنی اور بستی برمانی (موضع چہل چاہاں ڈاکخانہ شفقت گولا تحصیل و ضلع ڈیرہ غازی خان) کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔

جدید میکیاؤلی سیاست

عصرِ حاضر کی مغربی سیاست کا امام' اٹلی کا مشہور مدبر میکیاؤلی ہے ـــــ اور چونکہ دنیا کی دیگر اقوام پر بھی مغربی افکار و تصورات کا رنگ غالب آچکا ہے' اس لئے یوں سمجھئے کہ اس وقت قریب قریب ساری دنیا میں میکیاؤلی سیاست کا دور دورہ ہے۔ اس سیاست کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان کو کسی قاعدے اور قانون' اصول اور آئین کا پابند نہیں ہونا چاہیئے' بلکہ اپنے مفاد کی خاطر جو حربہ موزوں نظر آئے اسے اختیار کر لینا چاہیئے۔

> بادشاہ کے لئے صفت روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے ... عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے۔ یا جن وجوہات کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے' لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔ ..... صحیح حکمت عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے حکمت عملی یہ ہے کہ حسب موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے' اختیار کر لی جائے۔[1]

اس سیاست کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قدر مادی ترقی کے باوجود ـــــ جس کی نظیر اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی ـــــ ساری دنیا جہنم بن رہی ہے' جس میں نہ ایک فرد کو دوسرے فرد پر کوئی بھروسہ ہے۔ نہ ایک قوم کو دوسری قوم پر کسی قسم کا اعتماد۔ افراد ہوں یا اقوام، سب اپنی اپنی جگہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ نہ معلوم فریق مقابل ـــ بچشمہ وعدوں اور

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "انسان نے کیا سوچا" صفحہ ۳۲-۲۳۲

محکم معاہدوں کے باوجود، جن کی استواری کے لئے وہ اس قدر یقین دلا رہا اور قسمیں اٹھا رہا ہے۔ کس وقت کیا کرے۔؟ دنیا میں بے اعتمادی، سب سے زیادہ عدم اطمینان کا موجب ہوتی ہے۔ اور جس عالمگیر بے اعتمادی میں دنیا اس وقت گرفتار ہے اس کی مثال تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔ اور یہ سب نتیجہ ہے اس میکیاولی سیاست کا جس کا سکہ اس وقت ساری دنیا میں رواں ہے۔

اس کے مقابلہ میں سیاست کا ایک تصور قرآن پیش کرتا ہے جس میں ساری دنیا کو علی الاعلان بتا دیا جاتا ہے کہ یہ ہیں ہماری زندگی کے اصول۔ جن میں نہ کبھی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور نہ ہی آج ہم کسی حالت میں انحراف کر سکتے ہیں۔ افراد ہوں یا اقوام، ہم جس سے کوئی وعدہ کریں گے اس سے کبھی نہیں پھریں گے۔ اور جس سے کوئی معاہدہ ہوگا اس میں کبھی دغا نہیں کریں گے۔ خواہ اس میں ہمارا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ آپ غور فرمائیے کہ اس سیاست کی علمبردار قوم پر دنیا کو کس قدر بھروسا اور اعتماد ہوگا۔ اور اس سے افراد اور اقوام کس قدر اطمینان کی زندگی بسر کریں گی۔ اس انداز سیاست کی حامل قوم کو "مومن" کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں ـــ وہ جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکے۔ اور جو امن کا ضامن ہو۔ یہ کتنی بھروسہ اور امن عالم کی ضمانت قرآنی سیاست کا فطری نتیجہ ہے۔

یہ تھی وہ سیاست جس پر عمل پیرا ہونے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن وائے بدقسمتی کہ ہمارے ارباب سیاست نے اس مقصد عظیم کو فراموش کر دیا اور جس ڈگر پر باقی دنیا چل رہی تھی انھوں نے بھی اسی پر چلنا شروع کر دیا۔ (یہ ایک جگر خراش حقیقت ہے لیکن ہم اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کیونکہ زیر نظر موضوع اس سے الگ ہے۔)

عین اس وقت جب کہ ہمارے "دنیا دار" ارباب سیاست اپنی اپنی مہرہ بازیوں میں مصروف تھے، یہاں ایک آواز بلند ہوئی کہ ہم اس لادینی ماحول میں صحیح دینی سیاست کے جھنڈے گاڑنے کا عزم لے کر اٹھے ہیں آؤ اور ہمارا ساتھ دو۔

میکیاولی سیاست کے ستائے ہوئے مسلمانوں نے اس آواز کو نشید رحمت سمجھا اور اس دعوت دینے والوں کے ساتھ ہو لئے۔ پندرہ برس سے اقامت دین کی یہ تحریک ہمارے یہاں کارفرما ہے۔ اس تمام دوران میں اس نے جو کچھ کیا ہے، جب ایک غیر جانب دار مبصر اس پر نگاہ ڈالتا ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے۔ درویشی بھی عیاری

وہ دیکھتا ہے کہ "اقامت دین" کے ان مدعیان کے پیش نظر بھی حصول اقتدار کے سوا کوئی مقصد نہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے یہ بھی وہی حربے استعمال کرتے ہیں جنہیں لادینی سیاست کے علمبرداروں کی خصوصیت قرار دیا جاتا ہے۔ فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ لادینی سیاست کے بدنام مہرہ باز ان حربوں کو کھلے بندوں استعمال کرتے ہیں اور دینی سیاست کے یہ مقدس مدعی، انہیں اقامت دین کے نقاب میں چھپا کر، اور خدا اور رسول کے نام کی کمین گاہ کے پیچھے بیٹھ کر آگے بڑھاتے ہیں۔ آنے والا مورخ جب اس دور کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ ان مقدس مہرہ بازیوں کی پوری تفصیل پیش کرے گا۔ ہم اس وقت ان کی صرف چند ایک مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

سیاسی پارٹیاں

۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ اقامت دین کی تحریک کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نئے نئے شمالی ہند (سابقہ پنجاب) میں آئے تھے۔ اس وقت یہاں تحریک پاکستان کا عام شہرہ تھا۔ لوگ قائداعظمؒ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسلم لیگ کی طرف جوق در جوق آ رہے تھے۔ مودودی صاحب کی نگہ سیاست دان نے دیکھ لیا کہ اس وقت یہاں کسی اور جماعت سازی کا امکان نہیں، اسلئے مصلحت وقت کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت سازی کو خلاف اسلام قرار دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے رسائل حاضرہ میں قرآن اور اسوۂ رسول کی راہ نمائی" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ شائع کیا جس میں لکھا کہ

> یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے ۔۔۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت، یا کسی خاص نام، یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے ۔۔۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ (پیغام حق۔ فروری ۱۹۳۸ء ص ۸۳)

اس کے بعد انہوں نے خاموشی سے اپنی الگ پارٹی بنانے کے لئے فضا ہموار کرنی شروع کر دی اور تین سال کے بعد جماعت اسلامی کے نام سے یہ پارٹی معرض وجود میں آ گئی۔

یعنی جو بات ۱۹۳۸ء میں قرآن اور اسوۂ رسول اللہ کے یکسر خلاف تھی، ۱۹۴۱ء میں وہ عین مطابق اسلام قرار پا گئی۔

کیا میکیا ولی سیاست اس کے سوا کچھ اور ہوتی ہے ؟)

اور آگے بڑھیئے۔!

ناجائز بھی اور جائز بھی

مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے ایک بار صوبائی انتخابات کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ اسلام انتخابات میں امیدواری کو جائز قرار نہیں دیتا اس لئے کسی ایسے شخص کو ووٹ دینا جائز نہیں ، جو خود امیدوار بن کر میدان میں آیا ہو۔ لیکن ہوس اقتدار کی مصلحت کوشیوں نے حسب دستور جلد ہی اس دینی موقف کو بدل دیا یہ کہانی خود مودودی صاحب کے اپنے الفاظ میں سنئے ارشاد ہوتا ہے :۔

> جماعت اسلامی نے سنہ ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے۔ نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیار مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں ۔ ۔ ۔ اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو دفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتہً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی انھیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔ (ترجمان القرآن بابت مئی سنہ ۵۴ء صفحہ ۱۳۳)

ان چند سطور کا تجزیہ کیجئے۔ ان کے بین السطور پر غور فرمایئے۔ اور پھر دیکھیئے کہ الفاظ کے اس گورکھ دھندے میں خدا کے دین سے کس قسم کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یعنی

(i) امیدواری اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم کسی امیدوار کو ووٹ نہیں دیں گے۔

(ii) لیکن نئے تجربے کے بعد ہم جن امیدواروں کو ضروری سمجھیں گے انھیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔

(iii) ہم خود امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے [1]

کچھ سوچا آپ نے کہ یہ کس قسم کا دین ہے جو ذاتی مصلحتوں کے ساتھ بدلتا چلا جا رہا ہے۔ جو چیز کل تک ان کے دین میں ناجائز قرار پائی تھی وہ "تجربے کے بعد" سراسر اسلامی بن گئی۔ یہی حرکتیں اگر کسی سیاسی لیڈر یا سیاسی پارٹی سے

---

[1] سنہ ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں اپنے اس اسلامی موقف کی بھی [illegible] اور جماعت اسلامی کے علمبردار خود امیدواروں کی حیثیت سے میدان میں آ گئے۔

سرزد ہوتیں تو پوری دنیا میں ان کا مضحکہ اڑایا جاتا۔ لیکن یہاں یہ سب کچھ چونکہ اقامت دین کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے اس لئے ان کے تقدس میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہٹ دھرمی کی انتہا

اور معلوم ہے کہ یہ سب کچھ فرمالنے کے بعد، کوئی ندامت محسوس کرنے کے بجائے دعویٰ کیا کیا جاتا ہے ؟ اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کو زیر و زبر کرنے کے بعد آئندہ سطور میں ارشاد ہوتا ہے۔

> ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں در اصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی جو دین میں ممنوع ہو[1] (ایضاً)

چہ خوب! یعنی پہلی پالیسی بھی عین دین تھی اور تجربے کے بعد اس کے بالکل برعکس، جو دوسری پالیسی اختیار کی گئی وہ بھی عین اسلام — یعنی اس سے نہ تو کوئی اصول شکنی ہوئی ہے اور نہ یہ دین کے خلاف ہے — کوئی خدا کا بندہ ان سے پوچھے کہ آخر یہ ہے کیا۔ اور اس کے بعد ہمارے سیاست دان بیچارے کیوں "مفت میں" بدنام ہیں ؟ اگر یہ سب کچھ "دین" میں روا ہے تو مروجہ سیاست میں روا کیوں نہیں ؟

ایک مطالبہ اور خود ہی اس کی مخالفت!

امت میں الگ جمعیت قائم کرنا اسلام کے مزاج کے خلاف تھا۔ یہ قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی رہنمائی کے خلاف قرار پایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود الگ جمعیت بنائی گئی۔ انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے کرنے سے اجتناب کیا جائے گا۔ لیکن اس اعلان کے باوجود اپنے امیدوار کھڑے کر لئے گئے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ اب اگلا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ سابقہ مجلس دستور ساز سے "دستوری تجاویز" کے نام سے جو مطالبات کئے گئے ان میں مودودی صاحب کی طرف سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ اسمبلیوں میں پارلیمنٹری گروپ یا پارٹیاں بنانا آئینی طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔ مطالبہ کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں۔

> 8 — مجالس قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بہتر سے بہتر نمائندے منتخب کرنے کے لئے انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں مگر منتخب ہو جانے کے بعد ارکان مجلس قانون ساز کو پارٹیوں کی وفاداری سے آزاد ہو کر اپنے ضمیر و ایمان کے مطابق اپنے فیصلے انجام دینے چاہئیں۔
>
> (دستوری تجاویز۔ ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۴)

---

[1] اصول شکنی کا یہ الزام کسی باہر کے آدمی نے نہیں بلکہ خود انہوں نے ہی لگایا تھا اور اسی بنا پر وہ جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تھے۔

بڑا قابلِ قدر تھا یہ مطالبہ اور کسی قسم کا اعتراض اس پر وارد نہیں ہو سکتا۔ لیکن پتہ ہے اس مطالبے کا کیا انجام ہوا؟ - یعنی جو لوگ دوسروں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اسمبلیوں میں پارٹیوں کا وجود آئینی طور پر جرم قرار دیا جائے۔ آخر ایک دن انھوں نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ اسمبلیوں میں اپنی پارٹی قائم کریں گے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری پارٹیوں کے ارکان بھی انہیں شامل ہو سکیں گے۔

> لاہور ۹ر اگست (اسٹاف رپورٹر) جماعت اسلامی نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی پارلیمانی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے
> (کوہستان ۔ ۱۰ر اگست)

۲۰ر اگست ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی کی پریس کلب سے خطاب کرتے ہوئے مودودی صاحب نے فرمایا۔

> بہر حال جماعت اسلامی قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں "اسمبلی پارٹیاں" ضرور قائم کرے گی اور ان کے دروازے ہر رکن کے لئے کھلے ہوں گے۔ (کوہستان ۲۸ر اگست ۱۹۶۲ء)

اس ساری تفصیل کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا مودودی صاحب کی پیش کردہ "شریعت" اور میکیاولی کی بدنام سیاست میں کوئی فرق باقی رہ جاتا ہے؟ اگر ہے تو فقط یہ کہ میکیاولی سیاست کے علمبردار (سیاسی لیڈر) جو کچھ کرتے ہیں کھلے بندوں کرتے ہیں اور یہاں وہی کچھ خدا اور رسولؐ کے نام پر کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت کے فیصلے!

تحریک پاکستان میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت، قائداعظم کے ساتھ تھی۔ مودودی صاحب اس تحریک کے سخت مخالف تھے۔ ان سے کہا جاتا کہ مسلمانوں کی اس قدر اکثریت جس مطالبہ کے حق میں ہے آپ اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ سنئے کہ اس کے جواب میں وہ کیا کہتے۔ ارشاد ہوتا۔

> یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹ فی ہزار افراد اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمانوں کا نام ملتا چلا آرہا ہے۔ اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے ان کی اکثریت رائے کے

ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۴)

اور سنیئے!

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب ویابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قوم میں مہیا کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ ....

اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۵۵-۵۹)

اقامتِ دین کی اس بارگاہ سے ملتِ اسلامیہ کو ایک اور سرٹیفکیٹ عطا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ۔۔

مسلمانوں کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور ایک اصول لے کر اٹھی تھی اور مسلمانوں کا لفظ اس جماعت کے لئے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لئے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی۔ اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا۔ (ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

مودودی صاحب آگے بڑھتے ہیں۔ مسلم لیگ، انگریز اور ہندو کے مقابلے میں یہ دعویٰ لے کر کھڑی تھی کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس کے ساتھ ہے۔ مودودی صاحب اس دعوے کی مخالفت میں دنیا کو یہ سمجھاتے ہیں کہ اسلام کی رو سے مسلمانوں کی اکثریت "سوادِ اعظم" نہیں کہلا سکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

> بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سوادِ اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا فرض ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد در اصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں ..... مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہوں اور جنہیں کھرے اور کھوٹے کی ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو ان کے ہلڑ کا نام ہرگز سوادِ اعظم نہیں ہے۔ (ایضاً ـــ صفحہ ۴۸۰-۴۸۱)

چنانچہ مودودی صاحب اسلامی اغراض کے لئے نہ ان مسلمانوں سے کوئی اچھی امید وابستہ کرنے کے لئے تیار تھے اور نہ ان پر کسی قسم کا بھروسہ کرنے پر۔ وہ فرماتے ہیں۔

> ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے اسلامی اغراض کے لئے بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۵۸)

یہ تضاد کیوں

یہ ہیں اس برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے بارے میں مودودی صاحب کے آج سے بیس بائیس سال قبل کے ارشادات۔ اس وقت یہ پوری ملت، ایک قائد کی آواز پر اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے ایک صف میں کھڑی تھی۔ صدیوں کی تاریخ میں وہ پہلی بار مذہبی اختلافات اور خون، رنگ، نسل، اور ذات پات کی تمیز ختم کر کے ایک نصب العین پر متفق الخیال اور متحد العمل ہوئی تھی۔ مدتوں کے بعد اس نے پہلی بار صوبائی تعصبات کے بتوں کو توڑ کر ملتِ واحدہ کا تصور اپنایا تھا۔ ملک کے دشمن فکر و عمل کے اس حیرت انگیز انقلاب سے انگشت بدنداں تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن چونکہ ملت کی قیادت و امامت مودودی صاحب کے ہاتھ میں نہیں سونپی گئی تھی اس لئے ملت کی حیثیت ان کی نگاہوں میں وہ تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ چنانچہ انہوں نے اس باب میں یہاں تک کہہ دیا کہ

> ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں ...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی

کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے ..... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے .... مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے (ایضاً صفحہ ۴۹۰ - ۴۹۱ - ۴۹۲)

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب مسلمانوں کی اکثریت قائد اعظمؒ کے ساتھ تھی۔ لیکن جب مودودی صاحب نے پاکستان کے کچھ عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا تو پھر سنئے کہ انہی عوام کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے فرماتے ہیں۔

اگر شریعت کو ملک کا دستور اور قانون بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور قانون کی شکل اختیار کرے گی۔ جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہو۔

(ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۲-۱۳)

ہماری ملت کے یہ عوام بھی وہی تھے جو تقسیم سے پہلے قائد اعظمؒ کے ساتھ تھے ان میں کسی قسم کی تبدیلی آگئی تھی۔ اس وقت ان عوام کی کیفیت یہ تھی کہ ان میں ہزار میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اسلام کا علم رکھتا ہو۔ جو حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہو لیکن اب وہی مسلمان دین و شریعت کے معاملہ میں ایسے قابل اعتماد ہو گئے کہ شریعت کی وہی تعبیر، دستور اور قانون کی شکل اختیار کرے گی جسے یہ معتبر مانتے ہوں!

ایک اور کروٹ

وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کے دور حکومت میں جب مخلوط اور جداگانہ طریق انتخاب کی کشمکش برپا ہوئی تو سب کو یاد ہو گا کہ اس وقت محترم مودودی صاحب نے بڑی دھوم دھام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ طریق انتخاب کا فیصلہ ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) کے ذریعہ کرایا جائے۔ اس پر ان سے سوال کیا گیا کہ

کیا آپ یہ اصول قائم کرنا چاہتے ہیں کہ عوام کی اکثریت جس چیز کو حق کہے وہ حق اور جس چیز کو باطل کہے وہ باطل۔؟

اور ساتھ ہی یہ بھی پوچھا گیا کہ

جداگانہ انتخاب اگر دین اور شریعت کے اصول اور احکام کا لازمی نتیجہ ہے تو اس پر استصواب کے کیا معنی؟

ان اہم اور دینِ خداوندی سے متعلق بنیادی سوالات کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا۔ وہ بھی سن لیجئے۔!

> آپ کی آنکھوں کے سامنے نیشنل اسمبلی کی اکثریت نے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کیا اور وہ ملک کا قانون بن گیا۔ اب اس قانون کو اگر بدلا جا سکتا ہے تو اکثریت ہی کے فیصلے سے بدلا جا سکتا ہے ورنہ تمام علماء مل کر بھی فتویٰ دے دیں کہ مخلوط انتخاب اسلام کے خلاف ہے تب بھی قانون اپنی جگہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ ایسی حالت میں خواہ مخواہ خیالی باتیں[1] کرنے سے کیا فائدہ! آپ طریق انتخاب کے اس ملحدانہ قانون کو بدلوانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے وہ طریقہ اختیار کیجئے جو موجودہ جمہوری نظام میں ممکن العمل اور موثر ہو سکتا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت مئی ۵۸ء صفحہ ۱۰۸)

سن لیا جواب آپ نے! یعنی نیشنل اسمبلی نے جو قانون پاس کیا ہے وہ غیر اسلامی اور ملحدانہ ہے۔ اسے اسلامی بنانے کے لئے ملک میں ریفرنڈم کرایا جائے اور اس طرح عوام سے یہ فتویٰ حاصل کیا جائے کہ وہ مخلوط انتخاب کے ملحدانہ قانون کو پسند کرتے ہیں۔ یا جداگانہ انتخاب کو[2]۔ اس کے بعد جو کچھ فرمایا وہ بھی سن لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

> مجلس قانون ساز کے فیصلے اور ریفرنڈم کے فیصلے میں درحقیقت اصولی حیثیت سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں جگہ اکثریت ہی کا فیصلہ موثر ہوتا ہے۔ ایک جگہ مجلس قانون ساز کے ارکان کی اکثریت فیصلہ کرتی ہے اور دوسری جگہ ملک کے عام باشندوں کی اکثریت۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو لوگ مجالس قانون ساز کے معاملے میں اکثریت کے اختیارات قانون سازی کو مانے بیٹھے ہیں۔ وہ عوام کی اکثریت کے اختیار کا نام سنکر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔

سوچئے کہ سوال کیا تھا اور اس کا جواب کیا دیا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ جا رہا ہے کہ نیشنل اسمبلی کا فیصلہ ملحدانہ ہے اس

---

[1] دیکھا آپ نے کہ دین سے متعلق اس قدر اہم سوالات کس طرح حسب ضرورت "خواہ مخواہ کی خیالی باتیں" قرار پا گئے۔

[2] مخلوط انتخاب واقعی ملحدانہ قانون ہی ہے۔ لیکن یہ جداگانہ انتخاب جس کیلئے ریفرنڈم کا مطالبہ ہو رہا ہے کیونکر اسلامی قانون قرار پا گیا جبکہ اس کی رو سے بھی غیر مسلم اسی طرح اسلامی مملکت کی قانون سازی میں شریک ہوں گے جبکہ نظام دین اپنی قانون سازی میں کسی غیر مسلم کی شرکت قبول نہیں کرتا۔

لئے اب یہ چیز عوام کی رائے پر چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر عوام نے بھی مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟

ہٹ دھرمی کی انتہا اس کا جواب مزید دلچسپی کا باعث ہوگا۔ وہ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں:۔

> جس چیز کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ اگر ریفرنڈم میں اکثریت کا فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اسے حق مان لیں گے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ملک کا قانون وہ چیز قرار پائے گی جس کی تائید میں اکثریت نے فیصلہ دیدیا۔ ہمیں اس کے بعد بھی یہ حق رہے گا کہ اسے باطل کہیں۔

سارا جھگڑا یہ تھا کہ ایک پارٹی مخلوط انتخاب کو صحیح قرار دے رہی ہے اور دوسری جداگانہ انتخاب کو۔ نیشنل اسمبلی نے مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ مودودی صاحب دوسری پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ چونکہ ہم جداگانہ طریق کے حامی ہیں اور اسمبلی کا یہ فیصلہ نہیں مانتے اس لئے ملک بھر میں ریفرنڈم کرایا جائے۔ یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ان کے اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے ریفرنڈم کرایا گیا (لیکن اس کا فیصلہ ان کی منشا کے مطابق نہ ہوا) تو بھی ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ اور ہمیں حق حاصل ہے کہ اسے باطل کہتے رہیں۔

کیا کوئی شخص یہ بتا سکے گا کہ میکیاولی سیاست کی روباہ بازیوں میں اس قسم کے انوکھے داؤ پیچ میں کیا فرق ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کے قلب و دماغ پر ذاتی مفاد کا بھوت سوار ہو جائے اس وقت نہ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ پیش نظر معاملات میں خدا کا دین کیا فیصلہ دیتا ہے اور نہ یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ہم جو مطالبہ کر رہے ہیں اس کے مطابق فیصلوں کی پابندی بھی کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ جو چیز بھی اپنے مفاد کے حصول کا سامان کر دے وہی عین دین بن جاتی ہے۔ چاہے یہ کچھ خدا کے دین کا نام لے کر حاصل ہو، کسی اسمبلی کے فیصلے سے ہو۔ یا پھر عوام کے استصواب رائے کے نتیجہ میں۔ جس بارگاہ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے وہ ان کے نزدیک سرتاسر اسلام اور جہاں سے اس کی نفی ہو وہ سراسر الحاد اور باطل قرار پا جاتی ہے۔

مسلم لیگ سے اتحاد اور آگے بڑھئے۔

راولپنڈی کی پریس کلب میں مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد و تعاون کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

جماعت کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہو۔ جماعت کو دوسری سیاسی جماعتوں سے کوئی کد نہیں ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۸ راگست ۱۹۶۲ء)

یعنی تعاون کے لئے معیار صرف یہ ہے کہ دوسری پارٹی بھی ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہو۔ مودودی صاحب اُس مسلم لیگ سے تعاون کے لئے تیار ہیں جو قائداعظم کی قیادت سے بے نصیب ہونے کے بعد ہزاروں خرابیوں کی آماجگاہ بن گئی۔ لیکن یہی مسلم لیگ جب قائداعظم کی قیادت میں دس کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی آواز تھی جب ملت اسلامیہ کی نشاۃ کے لئے وہ انگریز اور ہندو کی منظم قوتوں سے چومکھی جنگ لڑ رہی تھی۔ پتہ ہے اس وقت اسی مسلم لیگ اور اس کی قیادت کی پشت میں چھرا گھونپنے کے لئے یہی حضرات کس قسم کا گھناؤنا کھیل کھیلنے کے لئے سرگرم کار تھے؟ پتہ ہے ان کا قلم اس وقت کس شدت سے اس کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھا اگر معلوم نہ ہو تو آیئے ہم آپ کے سامنے اس کا ایک ہلکا سا عکس پیش کردیں۔

گھناؤنی مخالفت

مسلم لیگ کے ان رہنماؤں کے بارے میں، جو مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے حصول کے لئے صف آرا تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

...... یہ "مسلمانوں کی قوم" میں پیدا ہوئے اس لئے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ)

انہی رہنمایانِ مسلم لیگ کے متعلق مزید لکھتے ہیں۔

جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی۔ جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملے میں نہ تو انہیں قرآن کا نقطۂ نظر ہی معلوم ہے اور نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں جن کو تو بہ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی سے ملتا ہے۔ اسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۹۶)

طبیعت ان دشنام طرازیوں سے بھی سیر نہیں ہوئی تو آگے بڑھتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے۔

پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو نماز کے وقت کوئی آپ کو یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمت قبلہ کدھر ہے؟ اور اسباب عیش سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔
(ایضاً۔ صفحہ ۶)

اور سنئے!

افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو۔ اور معاملہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی ومفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہے جیسی دنیا میں دوسری اور قومیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۳)

وہ قائد اعظم اور ان کے رفقا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور اس کلچر سے تبری کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی ومفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے نہیں۔ آپ کو تو بس اپنی قومیت کے لئے ایک نام چاہیئے۔ سو اس غرض کے لئے آپ جو نام بھی وضع کرلیں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی حیثیت پر اسی طرح دلالت کرنے لگے گا۔ آخر اس نوع کی قومیت میں کون سی خصوصیت ہے جس کے لئے لفظ "مسلمان" ہی کا استعمال ضروری ہو؟..........

آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کریں گے اس لئے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے اور کہیں اسی چیز کی مخالفت کریں گے اس لئے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے۔ کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور کبھی اسی پارٹی سے لڑیں گے۔ نہ اس لئے کہ آپ کے اور اس کے درمیان اصولی اتفاق یا اختلاف ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ آپ کے پیش نظر

اصول نہیں قومی "مفاد" ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیریکٹر سے ظاہر ہوگی دنیا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیریکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۵)

سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ کے موجودہ لیڈر، اُس زمانے کی مسلم لیگ کے لیڈروں کے مقابلے میں بہت زیادہ اسلام دوست ہو گئے ہیں جو ان کی طرف دستِ تعاون بڑھایا جا رہا ہے۔ اور یہ سوال بھی کہ کیا اُس زمانے کی مسلم لیگ نے ملک اور قوم کی کوئی ایسی خدمت نہیں کی تھی جس کے لئے مودودی صاحب اس سے اتنا سا تعاون کرنا بھی گوارا کر لیتے جتنا تعاون آج کی مسلم لیگ کے لئے روا رکھا جا رہا ہے۔

اسلامی ڈکٹیٹرشپ

ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیے۔

ایک زمانے میں اپنی پارٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب نے اعلان فرمایا تھا کہ یہ پارٹی "زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے گی۔ اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے گی"۔ اور اس سلسلے میں وہ جس قسم کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق انھوں نے صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ

> اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرہ کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔
>
> (اسلام کا نظریہ سیاسی)

یعنی مودودی صاحب صاف صاف اعلان کر رہے ہیں کہ ان کا قائم کردہ نظامِ حکومت اٹلی اور روس کے نظام سے ملتا جلتا ایک ڈکٹیٹرانہ نظام ہوگا۔ اب یہ بھی ان کے اپنے ہی الفاظ میں سن لیجئے کہ ان کے اس نظامِ حکومت کے صدر اور امیر کی حیثیت کیا ہوگی۔ پاکستان کے آئین کا جو مسودہ انھوں نے مرتب فرمایا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں۔

> امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ اور امیر کو یہ حق بھی ہوگا کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

یعنی اس مملکت کے امیر کو ایک آمرِ مطلق کی طرح یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ دینِ خداوندی کا نظام چلانے کے لئے جب چاہے مملکت کی پوری مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کے فیصلے کو مسترد کر کے اپنے حسبِ منشاء فیصلہ نافذ کر دے۔

ہم اس مرحلہ پر ایک اسلامی مملکت اور اس کے امیر کے مقام و منصب کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کس طرح اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر مودودی صاحب اپنے دینی موقف کو بار بار بدلتے اور اسلامی قدروں کو حسبِ ضرورت زیر و زبر کرتے چلے گئے۔ اسی طرح ایک وقت آیا جب انھوں نے اس موقف سے بھی گریز کی راہ اختیار کر لی۔ چنانچہ گزشتہ ۲۷ راگست کو جب انہیں راولپنڈی پریس کلب میں اخباری نمائندوں کے بعض سوالات سے دوچار ہونا پڑا تو انھوں نے پینترا بدلا اور فرمایا۔

> ہمارا نصب العین حقیقی اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ اس مملکت میں حکومت کے کام اسلام کے مطابق طے پائیں گے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم ملک میں اسلامی ڈکٹیٹر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی مملکت میں ہر شخص کو اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہوگی۔
>
> (کوہستان - ۲۸ راگست)

الفاظ پر غور فرمایئے۔ ایک طرف سالہا سال سے یہ اعلان چلا آرہا ہے کہ ہم نے جو اسلامی اسٹیٹ قائم کرنا ہے اسے فاشستی اور اشتراکی نظام سے یک گونہ مماثلت ہوگی۔ اس کے امیر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ عوام کے نمائندوں کی رائے کو مسترد کر کے اپنے فیصلے نافذ کر سکے۔ یعنی ایک ڈکٹیٹرانہ نظام سے ملتا جلتا نظام۔ اور اب جب کہ اپنی ہی سیاسی مصلحت کوشیوں نے ایک نئی صورت سامنے لا کر کھڑی کر دی تو جھٹ سے کہہ دیا کہ صاحب! ہم ملک میں اسلامی ڈکٹیٹر پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی اسلامی نظام تھا اور یہ بھی اسلامی نظام! یا للعجب!!

امیرِ جماعت کی اطاعت

واضح رہے کہ مودودی صاحب، اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے تو ڈکٹیٹر نہیں بننا چاہتے وہ اپنی جماعت کے امیر ہونے کی حیثیت سے اب بھی ڈکٹیٹر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ڈکٹیٹر بھی ایسا جس کی اطاعت، "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" ہے۔ انھوں نے نومبر ۱۹۵۵ء میں کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں، جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ

اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ (ہدایات صفحہ ۳۷)

اس ضمن میں یہ اضافہ موجب دلچسپی ہوگا کہ جب طلوع اسلام نے یہ کہا کہ جو نظام، قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرے (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے قائمقام ہو جاتی ہے۔ تو مودودی صاحب نے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا اور اسے ایسا سنگین جرم قرار دیا کہ اس پر کفر کے فتویٰ کو برحق قرار دیا۔ لیکن اپنی اطاعت کو "خدا و رسول" کی اطاعت قرار دینا عین مطابق اسلام سمجھا گیا۔ یعنی — خلافت علیٰ منہاج نبوت کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کا قائم مقام قرار دینا، ایک مسلمان کو کافر بنا دیتا ہے لیکن امیر جماعت اسلامی کی اطاعت کو "اللہ اور رسول" کی اطاعت قرار دینا عین مطابق اسلام ہے۔!

آپ نے غور فرمایا کہ ہمیں ڈکٹیٹرشپ کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔

معاذ اللہ معاذ اللہ

جو مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں — اور جن میں ابھی بہت سا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ان سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جو "ذہنی سیاست" مودودی صاحب کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے، اس میں اور میکیاولی کی لادینی سیاست میں۔ جن کا مظاہرہ عام ارباب سیاست کی طرف سے ہوتا ہے۔ کچھ بھی فرق نہیں۔ یہی چیز کچھ کم تاسف انگیز نہیں کہ دین کے نام سے اس طرح کا کھیل کھیلا جائے لیکن اس کا سب سے الم انگیز اور جگر سوز پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اس سیاست کی تائید میں دین کی مقدس سے مقدس اور عظیم سے عظیم شخصیت کو بھی بطور شہادت پیش کرنے سے نہیں جھجکتے چنانچہ جب مودودی صاحب کی روش پر ان کے اپنے حلقہ کی طرف سے اعتراض کیا گیا تو انہوں نے جھٹ سے فرما دیا کہ میں نے یہ کون سا انوکھا کام کیا ہے۔ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے اسلامی نظام کے جو اصول پیش فرمائے تھے جب عملاً اس نظام کو قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو حضورؐ نے ان اصولوں میں لچک پیدا کر لی۔ سنئے مودودی صاحب کے الفاظ میں کہ ان کے نشتر کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی

پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن

جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ ۔ امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

ہوس اقتدار کے اندھے جوش میں مودودی صاحب نے اپنے سراسر غیر اسلامی موقف کی تائید میں سطور بالا میں جو کچھ کہا ہے وہ ایسا نہ تھا کہ ہر شخص اسے خاموشی سے گوارا کر لیتا۔ چنانچہ جماعت کے اندر اور باہر ایک شور بلند ہوا اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ جب مودودی صاحب کے معتقدین اس صورت حال سے گھبرائے تو مودودی صاحب نے انہیں ڈانٹ کر کہا کہ تمہارا ایمان کمزور ہے جو اقامت دین کی اس پہلی منزل پر ہی گھبرا اٹھے ہو۔ یہ تو وہ وادی ہے جہاں اصولوں میں لچک پیدا کرنا تو درکنار جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ایضاً)

پناہ بخدا یہ کہنے کے بعد انہوں نے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے اس کی مثالیں بھی دے دیں۔ کلیجہ تھام کر سنئے!

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انھوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی[1] (ایضاً)

---

[1] غور فرمایا آپ نے کہ اپنے مطلب کیلئے اس قسم کی وضعی روایات کو بھی کس طرح سند میں پیش کیا جاتا ہے۔

اسے یاد رکھئے کہ دین خداوندی کے نام پر اس انوکھی حکمت عملی کا اعلان اس وقت ہو رہا تھا جب ۱۹۵۸ء میں (مارشل لا کے نفاذ سے قبل) ملک کے عام انتخابات قریب آ رہے تھے۔ اسلام کی یہ نئی تفسیر الیکشن کی پیش بندی کا شاہ کار بن کر سامنے آ رہی تھی اور دنیا کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ (نعوذ باللہ) خدا کے آخری دین میں (بوقت ضرورت) جھوٹ۔ مکر۔ فریب۔ دغا بازی۔ جعلسازی سب کچھ روا ہے اور دین خداوندی کو اس بے باکی سے بدنام اور رسوا کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح ملکی انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے حکومت کی کرسیوں پر قابض ہوا جائے۔ اگر سیاسی لیڈروں اسلام کی بدنامی کا موجب بنتے تو پتہ نہیں ان کے خلاف کیسے کیسے فتوے شائع کئے جاتے۔ اسٹیجوں اور ممبروں سے انہیں کیا کیا صلواتیں سنائی جاتیں۔ چونکہ یہ ارشادات "اقامت دین" کے نقاب میں سامنے آ رہے ہیں اس لئے نہ اس سے ایمان بگڑتا ہے اور نہ دین پر کوئی برا اثر پڑتا ہے۔

رشوت دیجئے صالحین کی اس "شریعت" میں یہی کچھ نہیں ہوتا بلکہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو مولانا مودودی کے ایک ممتاز اور پرانے معتقد حکیم عبدالرحیم اشرف (جو اب الگ ہو چکے ہیں) کا ایک بیان سن لیجئے جو اُن کے اپنے اخبار "المنیر" کی ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ محترم حکیم صاحب فرماتے ہیں۔

> میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ۱۰۔ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ملتان جیل میں ملاقات کی۔ اس موقع پر منجملہ دیگر امور کے "منکرین سنت" اور ان کے فتنے کا بھی ذکر آیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعت لٹریچر کی ایک اسکیم بتائی اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں فرمایا کہ آپ چوہدری غلام محمد صاحب[1] سے کہیں کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور وہاں کسی شخص کی تالیف قلوب کر کے اس سے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔

سن لیا آپ نے کہ ہمارے صالحین کی شریعت ان کے لئے کیسی کیسی انوکھی راہیں استوار کرتی ہے اور ان کے ہاں رشوت کے مذموم لفظ کے بجائے "تالیف قلب" کا پاکیزہ قرآنی لفظ کس ذلیل مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہے ——— دوسروں کے دفتروں سے ضروری کاغذات چوری کرنے کے لئے وہاں کے کسی

---

[1] یہ صاحب ان دنوں جماعت اسلامی سندھ کے قیم ہوتے تھے (اور اب کراچی کی جماعت کے قیم ہیں)

آدمی کو جو رشوت دی جائے وہ ان صالحین کی اصطلاح میں "تالیفِ قلوب" کہلاتی ہے۔ جب طلوعِ اسلام کے دفتر سے پتے چرانے کے لئے رشوت کی اس طرح تلقین کی جاتی ہے تو اپنے دیگر مفاد حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا ہوگا ـــــ خدا ہی جانتا ہے کہ اس نئی شریعت کا یہ سلسلہ ارتقاء کہاں تک پہنچے گا۔ کیا کچھ جائز سے ناجائز اور کیا کچھ ناجائز سے جائز قرار پائے گا ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

یہ سب کچھ اور پھر بلند بانگ دعویٰ

یہ ہے اقامتِ دین اور احیائے نظامِ اسلامی کے بیسویں صدی عیسوی کے دعوے داروں کی تصویر کی چند جھلکیاں۔ خدا کے دین سے جو مذاق ان حضرات نے روا رکھا ہے اس کی مثال ہماری گزشتہ تاریخ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکے گی۔ اور اس کے باوجود ان کے امیر مولانا مودودی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ

> جماعت اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس ملک میں قابلِ اعتماد کیرکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی ہمارے ملک کو اس وقت سب سے بڑی ضرورت ہے۔... جماعت اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس (یعنی پاکستانی مسلمانوں کی) سیرت دکردار والی قوم میں کہاں کہاں قابلِ اعتماد سیرت دکردار والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیرکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابلِ اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ (بحوالہ الاعتصام۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۵ء)

یہ ہے بلند بانگ دعویٰ اور وہ ہے اس کی عملی تفسیر جو پچھلے صفحات میں پھیلی ہوئی ہے ـــ یعنی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے جھوٹ، مکر، فریب، اصولوں سے فرار اور اقدار سے انحراف سب کچھ روا اور واجب قرار پا جاتا ہے۔

اور زندگی کی یہ ضرورتیں کیا ہیں؟ کسی نہ کسی طرح حکومت حاصل کرنا! اگر یقین نہ ہو تو مودودی صاحب کے اپنے الفاظ میں سن لیجئے کہ خدا کے دین کو بازیچۂ اطفال بنا کر وہ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبارِ دنیا کو چلانے کے لئے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی۔ طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے۔ نہ نام کہ وہ اپنے

ہاتھ میں لے اور زندگی کا نقشہ اپنی طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی نظریہ و ضابطہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا بے معنی ہے۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ ۲۱)

یہ ہے وہ اصل مقصد جس کے لئے مودودی صاحب ایسے ایسے حربے استعمال کر رہے ہیں جن سے نہ دین خداوندی کی مستقل قدریں محفوظ ہیں اور نہ حضور رسالتمآبؐ کی سیرۃ طیبہ کے جگمگاتے ہوئے نقوش۔ اور ایسا کرنے میں نہ وہ خدا کا خوف محسوس کرتے ہیں نہ دنیا کی شرم۔

یہ واقعات جماعت اسلامی کی ہر آن بدلنے والی "دینی سیاست" کی صرف چند ابھری ہوئی مثالیں ہیں۔ ورنہ اگر غور کیجئے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس جماعت کا پاکستان میں وجود اور جو کچھ انھوں نے پندرہ سال میں یہاں کیا ہے ان کے بے اصولاپن اور مصلحت آمیز سیاست کی زندہ شہادت ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں انھوں نے مطالبہ پاکستان کی شدت سے مخالفت کی۔ اس مخالفت کی وجہ تو کچھ اور تھی لیکن اس کے لئے جو دلیل دی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان کے پیدائشی مسلمان جب تک اسلام سے بیگانہ اور سیرت و کردار کے لحاظ سے پست ہیں ان پر مشتمل جو حکومت قائم کی جائے گی وہ کافرانہ حکومت ہوگی۔ ارشاد تھا۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں۔ اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت اپنی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی

(سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۲۹)

ان کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان کے پیدائشی مسلمانوں کو پہلے سچے مسلمان بناؤ اور پھر اپنی جداگانہ مملکت کا خیال کرو۔

اس وقت ہندوستان میں کیفیت یہ تھی کہ انگریز جا رہا تھا اور ملک کو ہندوؤں کے سپرد کر رہا تھا۔ قائداعظم کا مطالبہ یہ تھا کہ سارے کا سارا ملک ہندوؤں کے سپرد مت کرو۔ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں انھیں مسلمانوں کے سپرد کرو۔

مودودی صاحب سے کہا جاتا کہ اگر اس وقت یہاں کے پیدائشی مسلمانوں کو سچے مسلمان بنانے کا پروگرام شروع کر دیا اور پاکستان کے مطالبہ کو پس پشت ڈال دیا تو ہندوستان کا مسلمان انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی میں چلا جائے گا۔ اور ان کی غلامی سے نجات حاصل کرنا بڑا مشکل ہوگا۔ اس لئے اس وقت ملک کا جتنا حصہ ہمیں ملتا ہے وہ لے لینے دو۔ جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے گا تو اس میں رفتہ رفتہ اپنے تصور کی اسلامی

حکومت قائم کرلی جائے گی۔ اس کے جواب میں وہ کہتے۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاست اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ایضاً صفحہ ۶۰)

مودودی صاحب کی مخالفت کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا۔ اور دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ مودودی صاحب معہ اپنے رفقائے پاکستان آپہنچے اور یہاں آکر اعلان شروع کر دیا کہ ہم اس مملکت کو اسلامی مملکت بنائیں گے۔!

یہ وہی مودودی صاحب تھے جو ابھی (تقسیم سے پہلے) کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کے قومی اسٹیٹ کا اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل ہو جانا ناممکن ہے۔ دنیا حیران تھی کہ جو بات ابھی کل تک ناممکن تھی وہی اب کس طرح ممکن ہو گئی۔! اس پندرہ برس کے عرصے میں جو کچھ جماعت اسلامی نے کیا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ برابر پکارتے جا رہے ہیں کہ حکومت ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اسے اسلامی مملکت میں تبدیل کر دیں گے۔ اور یہ کہتے ہوئے انہیں اس کا قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ جس بات کو ہم اس شد و مد سے ناممکن کہہ رہے تھے اب اس کا مطالبہ خود کیسے کر رہے ہیں لیکن میکیاولی سیاست کی تو خوبی ہی یہ ہے کہ اس میں اس قسم کے احساسات کو پہلے ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنی پہلی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسٹیٹ اسلامی بن سکتا ہے۔ بہت اچھا! ہم اسے تسلیم کئے لیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اسٹیٹ کو اسلامی بنانے کے لئے انھوں نے اس پندرہ سال میں کیا کیا ہے۔! ان کا کہنا یہ تھا کہ "پیدائشی مسلمانوں" کو آہستہ آہستہ سچے مسلمان بناؤ۔ اس طرح سے اسلامی اسٹیٹ قائم ہو گا۔ اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان کا وہ کون سا پروگرام ہے جس کی رو سے انھوں نے ان پیدائشی مسلمانوں کو سچے مسلمانوں میں تبدیل کرنے کا کام شروع کیا ہے! انہوں نے اس پندرہ سال میں جو کچھ کیا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا ماحصل اس سے زیادہ کچھ نہیں نکلتا کہ یہاں جو حکومت قائم ہوئی انھوں نے اس کے ارباب نظم و نسق (یا سیاسی لیڈروں) کے متعلق یہ شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ لوگ شرابیں پیتے ہیں۔ جوا کھیلتے ہیں۔ ان کی بیگمات بے پردہ باہر نکلتی ہیں۔ کلبوں

میں جاتی ہیں۔ ڈانس کرتی ہیں۔ عریاں لباس پہنتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ ٹھیک ہے۔ ان لوگوں میں بالعموم یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ان لوگوں سے چھین کر ان مخالفت کرنے والوں کے حوالے کر دی جائے تو کیا اس سے یہاں کے "پیدائشی مسلمان" بچے مسلمان ہو جائیں گے۔ کیا اس [illegible] سے یہاں کی آبادی بھی —— جن کے متعلق یہ لوگ کہتے تھے کہ ان میں حق اور باطل کی تمیز ہی نہیں —— حق و باطل کی تمیز پیدا ہو سکے گی۔؟

اور اگر یہ کہیں کہ حکومت ہمارے حوالے کر دو، اس کے بعد یہ پیدائشی مسلمان بچے مسلمان ہو جائیں گے تو یہی بات جب تقسیم سے پہلے کہی جاتی تھی کہ پہلے مملکت قائم ہو جانے دو پھر یہ پیدائشی مسلمان بچے مسلمان بنا لئے جائیں گے تو اسے یہ ناممکن اور معجزہ قرار دیتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جو طریق کار (PROCESS) اس وقت ناممکن اور معجزہ تھا، اب ان کے ہاتھوں کس طرح ممکن اور معمولی واقعہ بن جائے گا۔!

آپ ان واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیںگے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے بے نقاب ہو کر آجائے گی کہ مودودی صاحب کے سامنے شروع سے آج تک ایک ہی مقصد تھا اور ہے۔ اور وہ یہ کہ

انا الموجود۔ لا غیری۔

تقسیم سے پہلے یہ دو قومی نظریہ کے قائل ہونے کے باوجود تحریک پاکستان کے مخالف ہوئے تو محض اس لئے کہ قوم نے "قائد اعظم" کسی اور کو کیوں بنایا؟ انہیں کیوں نہ بنایا۔

اور پاکستان بننے کے بعد ان کی طرف سے ہر حکومت کی مخالفت اس لئے ہو رہی ہے کہ حکومت کی کرسیاں ان کے حوالے کیوں نہیں کر دی گئیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں وہ کون سے جوہر ہیں جن کی بنا پر یہ اپنے آپ کو زمام حکومت سنبھالنے کے زیادہ اہل سمجھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ شراب نہیں پیتے۔ جوا نہیں کھیلتے۔ کلبوں اور رقص خانوں میں نہیں جاتے ان کی بیگمات بے پردہ باہر نہیں نکلتیں۔ لیکن کیا اسلامی حکومت کے لئے یہی منفی خصوصیات —— (NEGATIVE VIRTUES) کافی ہیں۔ اس کے لئے کسی مثبت کردار کی ضرورت نہیں؟ کیا جن لوگوں کا مثبت کردار یہ ہو کہ انہیں طلوع اسلام کے پتے چرانے کے لئے رشوت دینے تک میں باک نہ ہو، اسلامی حکومت اُن کے ہاتھوں قائم ہو گی؟ کیا اسی کو اسلامی کردار کہتے ہیں۔

ہم اس باب میں مودودی صاحب سے کچھ کہنا بیکار سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اقتدار کی ہوس نے انہیں

اس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں سے واپس آنا ان کے بس کی بات نہیں۔ بدقسمتی سے رعونت اور انانیت پہلے ہی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ اس پر ان کے حاشیہ نشینوں نے ـــ جن کے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہیں ـــ رفتہ رفتہ اس فریب کو ان کے ذہن میں راسخ کر دیا ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے ان سے بلند مقام پر کوئی اور نہیں ـــ لیکن ہم ان سعید فطرت، سادہ لوح مسلمانوں سے عرض کریں گے جو اس تحریک کو فی الواقعہ اقامت دین کی مساعی سمجھ کر ان کا ساتھ دے رہے ہیں کہ وہ ان حقائق کی روشنی میں جو گزشتہ صفحات میں پیش کئے گئے ہیں ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ جس راستے پر انہیں چلایا جا رہا ہے وہ انہیں کس طرف لئے جاتا ہے۔ کیا انہیں خدا کے بچے دین کی اقامت کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے یا اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کیا جاتا ہے؟

سوچئے اور سوچنے کے بعد خود ہی صحیح نتیجہ پر پہنچئے۔

ان کے ساتھ ہی ہم ملک کے ارباب فکر و نظر سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ بھی سوچیں کہ ملک میں یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور قوم کو خدا اور رسولؐ کے نام پر کس تباہی کے جہنم میں دھکیلا جا رہا ہے۔

جب آپ ان حقائق پر گہری نظر سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ طلوع اسلام اس تحریک کی اس شدت سے مخالفت کیوں کر رہا ہے۔ اور وہ کتنا بڑا خطرہ ہے جس سے یہ قوم کو متنبہ کر رہا ہے۔ ـــ خدا کرے کہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے اور آپ اس غلط فہمی سے نکل جائیں کہ یہ محض "اقرار و انکار حدیث" کا جھگڑا ہے جس سے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ یہ "اقرار و انکار حدیث" کا جھگڑا نہیں۔ چونکہ طلوع اسلام ان حضرات کے ان مہلک اور تباہ کن عزائم کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے دلائل کا جواب ان سے بن نہیں پڑتا اس لئے انہوں نے لوگوں کی توجہات کو دوسری طرف منعطف کرنے کے لئے اس قسم کا پراپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے کہ طلوع اسلام منکر حدیث ہے اور منکر رسالت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قسم کا حدیث اور رسالت کا منکر یہ حضرات طلوع اسلام کو قرار دیتے ہیں اس سے کہیں زیادہ منکر حدیث و منکر شان رسالت خود مودودی صاحب ہیں بلکہ وہ حضورؐ رسالتمآب کی شان اقدس و اعظم میں (معاذ اللہ) جس گستاخی تک اتر آئے ہیں طلوع اسلام کی تو اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ اقرار و انکار حدیث کا سوال نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا تعلق آپ سے اور آپ کی آنے والی نسلوں سے ہے۔ بلکہ خود پاکستان کے مستقبل سے ہے۔

اس "مقدس سیاست" کے یہ خطرات تو کچھ دیر بعد میں جا کر سامنے آئینگے۔ اس کا ایک اثر ابھی سے اپنے نتائج مرتب کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے غلط معاشرہ میں قوم کی اخلاقی حالت جس قدر پست ہو چکی ہے وہ کسی

سے پوشیدہ نہیں۔ بایں ہمہ، وہ ابھی تک جرم کو جرم اور عیب کو عیب سمجھتے تھے۔ اب جو ان کے سامنے یہ "نئی شریعت" آئی جس کی رو سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اصول شکنی: جھوٹ۔ فریب۔ رشوت سب جائز، بلکہ بعض اوقات، واجب، قرار پا گئے۔ تو لوگوں کے دلوں سے احساسِ ندامت بھی اٹھ گیا۔ اور جو کچھ وہ پہلے چھپے چھپے سے کرتے تھے اب دھڑلے سے ہونے لگا۔ اس طرح قوم کے دل سے اسلامی اقدار کا احترام بھی ختم ہو گیا۔ اور نوجوانوں کے ذہن میں "اسلامی حکومت" کا ایک ایسا تصور پیدا ہو گیا جو دنیا کی لادینی حکومتوں سے کسی صورت سے بھی مختلف نہیں۔ اب وہ بے باکانہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہی ہیں اسلامی معاشرہ کی وہ خصوصیات جن کے تحفظ کے لئے ہم ہندوستان سے الگ ہوئے تھے؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے خود نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق ان نوجوانوں کے دل میں جو نقشہ مرتب ہوتا ہے وہ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے!

سوچئے کہ یہ نقصانات کس قدر تباہ کن ہیں؟

طاہرہ کے نام خطوط

ماؤں کی آغوشِ تربیت ہر قوم کی داستانِ عروج و زوال کا حرفِ آغاز بنتی ہے۔ خدا کا دین ملت کی ہر بہو بیٹی اور ماں کو کس بلند مقام پر فائز کرتا ہے؟ ان کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا انقلاب لانا چاہتا ہے؟ اس انقلاب کی بدولت ہماری عائلی زندگی کے تلخیاں کیونکر جامِ شیریں کی گردش میں بدل سکتے ہیں؟ نئی نسل کی تربیت کس حسنِ انداز سے ہو گی؟

ان اہم سوالات کا جواب، قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں، اس کتاب میں دیکھئے!

ان خطوط کے ذریعے پرویز صاحب نے اپنی ملت کی ہر طاہرہ بیٹی کو قرآن کا زندگی بخش پیغام دیا ہے

جلد اول ——— دو روپے
جلد دوم ——— ڈھائی روپے

میزان پبلیکیشنز ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

عائلی قوانین پر اعتراضات اور اُن کے جواب

(سید لطیف شاہ صاحب و رفیع اللہ اختر صاحب)

انسانی تمدن کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کے کسی فکری نظام نے عورت کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کیا۔ یہ کتنا ہولناک ظلم ہے کہ جس عورت نے افلاطون و ارسطو کو جنم دیا اسی عورت کو وہی ارسطو اور افلاطون گناہوں کا شیطان قرار دیئے گئے۔ حق یہ ہے کہ عورت کی مظلومیت کی دردناک تاریخ اتنی ہی طویل ہے جتنی طویل خود نوعِ انسانی کی تاریخ ہے۔ اس صنف کو ہمیشہ موجبِ ننگ و عار سمجھا گیا۔ بیٹی نے جس دور میں جس گھر میں بھی جنم لیا باپ کی جھوٹے غرور سے اکڑی ہوئی گردن جھک گئی اور چہرے پر جاہلی تخیل ندامت کی سیاہی پھر گئی۔ خدائے قدوس نے اسی انسانیت سوز ذہنیت کی نقاب کشائی کی ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى
هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (سورہ النحل - ۵۹/۱۶)

جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے ندامت کا جو داغ اُسے

لگ جاتا ہے وہ اس کی وجہ سے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے پھروں یا اسے مٹی میں دبا دوں۔

جب اسلام کا آفتاب حق و صداقت طلوع ہوا، تو پیشوایانِ مسیحیت ان بحثوں میں مصروف تھے کہ عورت انسان بھی ہے یا نہیں اور اسے روح بھی عطا کی گئی ہے یا نہیں؟ ہندومت ویدوں کی مقدس تعلیم کے دروازے عورتوں پر بند کر چکا تھا۔ بدھ مت یہ اعلان کر چکا تھا کہ عورت سے تعلق رکھنے والے کے لئے نروان کی راہیں مسدود ہیں۔ علمائے یہود یہ طے کر چکے تھے کہ عورت گناہِ آدم کی اصل ذمہ دار ہے اور اگر یہ سالن میں نمک زیادہ ڈال دے تو اُسے شرعی طلاق دی جا سکتی ہے۔

اس ماحول میں عرب کے انقلاب آفریں داعی کی یہ زلزلہ انگیز صدا بلند ہوئی کہ عورت اور مرد کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے اگر مرد انسان ہے تو عورت بھی انسان ہے اور اگر مرد کی روح ہے تو عورت بھی اس سے محروم نہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ۔ (النساء ۴)

اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔

اس نے پکار کر کہا کہ عورت جہنم کا ایندھن نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ ارتقائے روحانی کے جو مدارج مرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت بھی حاصل کر سکتی ہے۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ۔ (۴/۱۲۴)

اور جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت مگر ہو ایماندار تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

یہ اُسی داعیٔ انقلاب کی پاکیزہ تعلیم تھی جس نے عورتوں کو غلام سمجھنے والے مردوں کو بتا دیا کہ

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ ۔ (۲/۲۲۸)

عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں۔

یہ اسی صادق و مصدوق پیغمبرؐ کی زبانِ حق ترجمان تھی جس نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کی پیدائش کلنک کا ٹیکہ نہیں بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسائی انسان کو جنت کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو ضم اصابعہ۔
(مسلم کتاب البر والصلۃ والادب)

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور

وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے۔

من ابتلی من البنات بشئی فاحسن الیھن کن لہ سترا من النار۔ (مسلم الیقام)

جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ بحسن و خوبی ان کی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

یہ وہی اس صنفِ ضعیف کے غم خوار تھے جنہوں نے شوہروں کو بتایا کہ نیک بیویاں نعائم خداوندی ہیں۔

خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ۔ (نسائی۔ کتاب النکاح)

دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔

اور یہ کہ۔

لیس من متاع الدنیا شئی افضل من المراۃ الصالحۃ۔ (ابن ماجہ کتاب النکاح)

دنیا کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت نیک بیوی سے بڑھ کر نہیں۔

یہ مساوات انسانیہ کے مبلغ ہی تھے جنہوں نے حجۃ الوداع کے اس خطبہ میں بھی عورتوں کے معاملہ میں تختی سے تاکید فرمائی جو خطبہ نوع انسانی کے لئے منشورِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

فاتقو اللہ فی النساء ان لکم علی نساء کم حقا و لھن علیکم حقا۔

عورتوں کے معاملہ میں بھی قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں۔

آج کی دنیا میں "حقوقِ نسواں" اور "بیداریِ نسواں" کے جو ساز چھڑ رہے ہیں یہ دراصل اُسی ساز صد آہنگ کی صدائے بازگشت ہیں جس نے مدینہ کی گلیوں میں اپنے دلنواز نغمے بکھیرے تھے۔ لیکن بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اسی اسلام کے نام لیواؤں نے صدیوں سے عورت کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھ رکھا ہے۔

ماضیِ قریب میں حکومت نے عائلی قوانین پاس کر کے عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق دلانے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا لیکن قوم کی تیرہ بختی ملاحظہ ہو کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن میں یہ تحریک پیش کر دی گئی کہ ان قوانین کو منسوخ کر دیا جائے۔ افسوس ہے کہ ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے

اس پر دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی روشنی میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بجائے عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے اور اس طرح دین و دانش سیلاب کی رَو میں بہہ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جس نے قسم کھا رکھی ہے کہ حکومت جو قدم اٹھائے اس پر فوراً "خلافِ اسلام" کا ٹھپہ لگا دیا جائے۔ خواہ وہ اقدام عین مطابق اسلام ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کا "دین دھرم" یہی ہے کہ عورت کو ہمیشہ جوتے تلے رکھنا چاہیئے۔ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ عورتوں کو کسی قسم کے حقوق حاصل ہوں۔

عائلی قوانین کے خلاف علماء حضرات کی طرف سے جو اعتراضات عام طور پر کئے جاتے ہیں۔ ہم نے ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں کوشش کی گئی ہے کہ ان اعتراضات کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ کتاب و سنت اور فقہ کی رُو سے ان کا وزن کیا ہے اور عائلی قوانین کی پوزیشن کیا؟ واضح رہے کہ جو اعتراضات ہم نے اپنے سامنے رکھے ہیں ان کا تعلق کسی خاص طبقے سے نہیں۔ ملک کے مختلف گوشوں سے اٹھنے والے جس قدر اعتراضات ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ہم نے ان سب کو لے لیا ہے۔ نہ ہی اس باب میں ہماری پوزیشن فریق مخالف کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ چیز دین میں سنگین جرم ہے کہ انسان ایک خاص فریق کی حیثیت سے کر کھڑا ہو اور ہر بات کو اس فریق کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے۔ ہم نے یہ جائزہ صرف اس مقصد کے لئے لیا ہے کہ دیکھیں۔ حق کس طرف ہے۔

نکاح کی رجسٹری دفعہ نمبر (۵)

عائلی قوانین میں اسے لازم قرار دیا گیا ہے کہ نکاح کے معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرا دیا جائے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اس کے خلاف اعتراض یہ عائد کیا جاتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں نکاح خواں کا کوئی باقاعدہ منصب نہیں۔ اگر مرد اور عورت نے دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کر لیا ہو تو نکاح ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نکاح کا خطبہ پڑھا جانا بھی ضروری نہیں نہ ہی کسی عالم کا موجود ہونا ضروری۔ لیکن رجسٹریشن کا حکم نکاح خواں کو ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ اعتراض سرے سے غلط ہے۔ عائلی قوانین میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ "قوانین شریعت کے مطابق عمل میں آنے والی ہر شادی کو..... درج رجسٹر کرایا جائے"۔ اسی طرح جیسے بیع و شریٰ اور دیگر معاہدات کو درج رجسٹر کرایا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کون سی بات خلاف شریعت ہے۔

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

رجسٹریشن کے سلسلہ میں علماء کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ نکاح کی رجسٹری نہ کرانے کو جرم قرار دینا غلط ہے۔ رجسٹریشن کے سلسلے میں یہ اعتراض بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ نکاح چونکہ ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا

بہت ضروری ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے باہمی لین دین کے معاملات کو تحریر کرنے کی سخت تاکید کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ
مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ (۲/۲۸۲)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی جب تم میعادی "دین" کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

ذرا آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کی یہ علت بیان فرمائی ہے۔

ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا (۲/۲۸۲)

یہ کتابت اللہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قرینِ عدل ہے۔ اور شہادت کو درست تر رکھنے والی ہے اور زیادہ مستوار ہے اس کی کہ تم شبہ میں نہ پڑو۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے کا حکم محض اس لئے دیا گیا کہ کتابت اقسط عند اللہ اور اقوم للشہادۃ ہے۔ علامہ آلوسی نے عند اللہ کے معنی کئے ہیں۔ "ای فی حکمہ سبحانہ" (روح المعانی) یعنی اللہ کے قانون وضابطہ میں کتابت بہت زیادہ قرینِ عدل اور ہمیشہ قائم رہنے والی شہادت ہے۔ اب چونکہ لین دین اور نکاح میں علت حکم (شہادت) مشترک ہے اور

"احکامِ فقہیہ کے استنباط میں یہ اصول قریب قریب ساری امت میں متفق علیہ ہے کہ جس صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم نہ پایا جاتا ہو اس کو کسی ایسی صورتِ معاملہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں حکم موجود ہو۔ بشرطیکہ دونوں میں علتِ حکم مشترک ہو۔"

(حقوق الزوجین طبع ششم ص ۳۶)

پس نکاح کیلئے بھی کتابت کا حکم قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ویسے نکاح کا معاہدہ تو دین سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے پس اگر حکومت نے اس کی رجسٹری کی تاکید کر دی تو کون سا خلافِ اسلام فعل سرزد ہو گیا۔ بفرض المحال اگر آیت مذکورہ کو دین سے ہی مقید تسلیم کیا جائے تب بھی نکاح کی رجسٹری ضروری قرار پاتی ہے۔ کیونکہ فقہاء مہر موجل کو دین ہی سمجھتے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے جہاں یہ مسئلہ لکھا کہ عورت نے اگر اپنی زندگی میں مہر وصول نہیں کیا تو اس کی موت کے بعد یہ مہر ورثاء کو ملے گا وہاں تصریح کر دی۔

فلان المسمی "دین" فی ذمتہ (ہدایہ اولین ص ۳۰۶)

کیونکہ مہر خاوند کے ذمہ قرضہ ہے۔

مصنف مذکور آگے چل کر نکاح الرقیق کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

وإذا تزوج العبد باذن مولاه فالمهر دين في رقبته يباع فيه (الهدایہ[1])

اگر غلام اپنے آقا کی رضامندی سے نکاح کرے تو مہر اس کے ذمہ دین ہے۔ جس کے عوض اسے بیچا جا سکتا ہے۔

جب مہر دین قرار پایا تو اس کی کتابت کو کیوں نہ لازمی قرار دیا جائے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اس بات کو دیکھئے کہ رجسٹریشن کوئی نئی چیز نہیں۔ ہارون الرشید عباسی کے زمانہ میں بھی مسلمانوں اور ذمیوں کے لئے نکاحوں کی رجسٹریشن لازمی تھی۔ خیال رہے کہ ہارون کے قاضی القضاۃ فقہ حنفی کے ستون قاضی ابو یوسفؒ تھے سوچئے کہ اگر یہ چیز خلاف اسلام ہوتی تو کیا امام ابو یوسفؒ اسے برداشت کر سکتے تھے۔ ضمناً تحریر ہے کہ رجسٹریشن صرف پاکستان میں جاری نہیں۔ بلکہ مصر، شام، لبنان اور شرق اردن میں بھی یہی قانون ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ

(ا) قرآن نے لین دین کے معاملات کو لکھنے کا حکم دیا ہے اور نکاح کی رجسٹریشن کا حکم بھی اسی حکم پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(ب) رجسٹریشن ہارون الرشید کے زمانہ میں لازمی تھی اور قاضی القضاۃ امام یوسفؒ نے اسے خلاف اسلام قرار نہیں دیا۔

(ج) رجسٹریشن آج بھی مصر، شام، لبنان اور شرق اردن میں لازمی ہے۔

(د) رجسٹریشن کی کتاب و سنت میں ممانعت نہیں اس لئے یہ کم از کم مباح تو ہے۔

اب سوچئے کہ کیا اس کی خلاف ورزی کو جرم مستلزم سزا ٹھہرانا کوئی خلاف شرع فعل ہے۔ ایک ایسی چیز جس کا حکم قرآن حکیم سے اشارۃً بھی ثابت ہو جائے اگر اس کی خلاف ورزی کو قانونی جرم قرار دے کر مجرم کو سزا دی جائے تو ہمارے خیال میں اسے کسی صورت میں خلاف اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علمائے کرام تسلیم کرتے ہیں کہ مجلس واحد میں تین طلاق دینے والے کو نبی صلعم اور صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں کوئی سزا نہ ملتی تھی لیکن فاروق اعظمؓ ایسے شخص کو درّے مارا کرتے تھے۔

---

[1] SYED AMIR ALI :- MOHAMMADAN LAW p. 370 V. 2

ایک مفید چیز کو اگر لازم کر دیا جائے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی طور پر سزا دی جائے تو اسے خلافِ اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً ٹریفک کے قواعد کی پابندی مفید ہے۔ پس اگر گورنمنٹ ان کی خلاف کرنے والے کو سزا دے تو اس میں کیا حرج ہے۔

تیسرا اعتراض اور اس کا جواب

رجسٹریشن کے سلسلے میں یہ پوچھا جاتا ہے کہ اگر ایک مرد اور عورت کا نکاح ہو جائے لیکن وہ رجسٹر نہ کرائیں تو کیا اس نکاح کو عدالت تسلیم کرے گی یا نہیں اور اس عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا جائز وارث تسلیم کیا جائے گا یا نہیں۔ اس سے پیدا شدہ اولاد کو جائز اولاد مانا جائے گا یا نہیں۔ وہ اولاد اپنے باپ سے میراث پائے گی یا نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر معترضین نے بیاہ شادیوں کی رجسٹریشن کے ذیلی دفعات اچھی طرح پڑھ لئے ہوتے تو یہ اعتراض کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ عائلی قوانین میں رجسٹریشن نہ کرانے کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ جس نکاح کی رجسٹری نہیں کرائی جائے گی وہ نکاح، نکاح ہی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

ایک عجب اعتراض

بعض حضرات کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ رجسٹریشن کی شرط سے اس خرابی کا بھی کافی امکان ہے کہ بعض شریر النفس لوگ رشوت وغیرہ دے دلا کر سرکاری رجسٹر میں وضعی اندراجات کرالیں اور اس طرح فرضی نکاح کا ثبوت پیش کر دیں۔

ہمیں حیرت ہے کہ یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے جن کے ہاں محض دو گواہوں کے سامنے ایجاب قبول کر لینے سے شرعاً نکاح صحیح منعقد ہو جاتا ہے۔ ان دو گواہوں کے متعلق فقہ حنفی میں ہے کہ دو شرابی بھی اگر ایجاب و قبول کے وقت موجود ہوں اور نشہ کی حالت میں وہ سمجھ رہے ہوں کہ نکاح ہو رہا ہے چاہے بعد میں وہ بھول بھی جائیں تو بھی نکاح صحیح قرار پا جاتا ہے۔ گواہوں کے متعلق حنفیہ کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالرحمٰن الجزائری لکھتے ہیں۔

وینعقد بحضرة السکاری اذا کانا یعرفان ان ھذا ینعقد بہ النکاح ولو لم یذکروہ بعد الافاقة من السکر۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص۱۸)

وہ ایسے آدمیوں کے سامنے جو نشہ میں مدہوش ہوں۔ نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ دونوں جانتے ہوں کہ یہ نکاح ہو رہا ہے۔ چاہے وہ حالت سکر کے بعد بھول ہی کیوں نہ جائیں۔

اور آگے بڑھئے۔ بخاری شریف میں ہے۔

وقال بعض الناس ان لم تستاذن البکر ولم تزوج فاحتال رجل فاقام شاہدی زور انہ تزوجہا برضاہا فاثبت القاضی نکاحہا والزوج یعلم ان الشہادۃ باطلۃ فلا باس ان یطاہا وہو تزویج صحیح۔ (بخاری شریف ج ۲ کتاب الحیل باب فی النکاح)

اور بعض لوگ (حنفی) کہتے ہیں اگر کنواری لڑکی کی اجازت نہ لی جائے۔ اور اس نے نکاح نہ کیا ہو پھر ایک شخص نے حیلہ کیا اور دو جھوٹے گواہ کھڑے کئے کہ اس نے اپنی رضا سے نکاح کیا ہے اور قاضی صاحب نے نکاح کو درست قرار دیا۔ مرد جانتا ہے کہ گواہی جھوٹی ہے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ اس سے ہمبستری کرے اور وہ نکاح صحیح ہے۔

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

وقال بعض الناس ان احتال انسان بشاہدی زور علی تزویج امراۃ ثیبۃ بامرہا فاثبت القاضی نکاحہا ایاہ والزوج یعلم انہ لم یتزوجہا قط فانہ یسعہ ہذا النکاح ولا باس بالمقام لہ معہا (ایضاً)

اور بعض لوگ (حنفی) کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حیلہ کرے اور دو جھوٹے گواہ اس بات پر پیش کر دے کہ اس نے ایک ثیبہ عورت سے اس کی رضامندی کے ساتھ نکاح کیا ہے اور قاضی نکاح کو درست قرار دے تو یہ نکاح صحیح ہوگا۔ حالانکہ مرد جانتا ہے کہ اس نے کبھی اس سے نکاح نہیں کیا۔ تاہم اسے عورت کے ساتھ رہنے میں کوئی حرج نہیں۔

خود فقہ حنفی کی معتبر کتابوں سے امام بخاریؒ کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں :-

ومن ادعت علیہ امراۃ انہ تزوجہا واقامت بینۃ فجعلہا القاضی امراتہ ولم یکن تزوجہا وسعہا المقام معہ وان تدعہ یجامعہا۔ (ہدایہ اولین ص ۲۸۱)

اگر کسی عورت نے کسی مرد پر دعویٰ کیا کہ وہ اس کا خاوند ہے اور اس پر دلیل قائم کر دی اور قاضی نے اسے اس کی بیوی قرار دے دیا تو اس کا اس کے ساتھ ٹھہرنا صحیح ہے اور اگر وہ اُسے

بلائے تو ہمبستری کرے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہدایہ کی عبارت نقل کرکے یہ الفاظ زائد کئے گئے ہیں۔

وکذا الداعی علیہ النکاح فحکمہ کذلک

(فتاویٰ عالمگیری ج ۱ صـ۱۰۲)

اس طرح اگر کوئی مرد کسی عورت کے متعلق جھوٹا دعویٰ کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

طلاق کے متعلق بھی یہی حکم ہے شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں۔

واذا شهد شاهدان على رجل انه طلق امراته ثلاثا وحجد الزوج والمراة ذلك فرق بينهما۔ (مبسوط ج ۶ صـ۱۴۸)

اگر دو گواہ گواہی دے دیں کہ فلاں مرد نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اور خاوند اور بیوی اس سے انکار کردیں تب بھی وہ دونوں جدا کردئے جائیں گے۔

ہم ان معترض حضرات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا نکاح کے سلسلے میں خرابیوں کا زیادہ امکان اس صورت میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یا رجسٹریشن کی صورت میں جس میں چار پانچ فارم بھرنے پڑتے ہیں ہر فارم پر مرد اور عورت اور گواہوں کے دستخط ہوتے ہیں۔ مکمل شدہ فارم کا ایک پیپر خاوند کے پاس رہتا ہے اور دوسرا بیوی کے پاس۔ اور ایک فارم حکومت کے ریکارڈ میں۔ تاکہ کسی جھگڑے تنازع کی صورت میں اسے بطور شہادت پیش کیا جا سکے۔ اگر کوئی شخص سرکاری ریکارڈ میں غلط اندراجات کرانا بھی لے گا تو اس فارم پر میاں اور بیوی کے دستخط کیسے کرائے گا۔ اور جو فارم خود میاں اور بیوی کے پاس ہوں گے ان میں تبدیلی کیسے کرا سکے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس قسم کے اعتراضات کرنے والے حضرات کس طرح اس ذہنیت کے حامل ہیں کہ جو کچھ حکومت کی طرف سے ہو اس کی بہرحال مخالفت کی جائے۔ خواہ وہ فیصلہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو۔

تعددِ ازدواج پر پابندی

دفعہ نمبر (۶)

عائلی قوانین کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت مخصوص حالات کے ماتحت دی جا سکتی ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جس اجازت کو شریعت نے عام رکھا ہے اسے بعض شرائط سے مقید کر دینا خلاف اسلام

ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے بلکہ پاک و ہند کے معروف اور بلند پایہ عالم دین جناب علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم کی ایک عبارت نقل کئے دیتے ہیں۔ علامہ مذکور کے علم و تقویٰ سے ہمارے علماء کرام انکار نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی انہیں مغرب زدہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ علامہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"تعدد ازدواج کے مسئلہ میں امام (امام اعظم ابو حنیفہؒ) کا جو نقطۂ نظر تھا دوسری جگہ لوگوں نے اس کو بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم (غالباً النخعی) کے متعلق امام صاحب سے کسی نے اس قصہ کا ذکر کیا کہ کسی نے بدیشہ کوئی کپڑا ان کی خدمت میں پیش کیا لیکن لینے سے انھوں نے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ خرید لیجئے بولے کہ میاں چار سو درہم میرے پاس اگر ہوتے تو دوسری بیوی نہ کرتا جو تمہارا کپڑا خریدتا۔ اس نے کہا کہ ایک بیوی کیا آپ کے لئے کافی نہیں بولے کہ ان حاضت حضت (جب اس کے ایام کا زمانہ آتا ہے تو میں بھی گویا ایام ہی میں بیٹھ جاتا ہوں) امام صاحب نے اس قصے کو سن کر کہا کہ بھائی مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا سرور میں رہتا ہے۔ دو بیویوں والا شرور کا شکار بنتا ہے۔ یعنی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر امام صاحب نے فرمایا کہ میرے ساتھ جسے اتفاق نہ ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے۔ یا شاید جابرؓ ہی کا یہ قول نقل کیا اور کہا کہ ابراہیم کو شاید تجربہ کا موقع نہ ملا اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا۔ جو اس برتاؤ کو نہ کر سکے تو ظالموں میں لکھا جائے گا۔ پھر وہ حدیث سنائی کہ دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے والا قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہو گا۔ امامؒ نے اس پر اور اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت۔ اپنے لئے تو میں نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے اور فرمایا کہ بھائی بے فکری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر عورتوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے ان الفاظ کو دہرایا کہ یہ عورتیں تمہارے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہیں پس ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہنا۔ راوی کا بیان ہے کہ دیر تک امام صاحب اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے لیکن مجھے بس اس قدر یاد رہ گیا۔ کاش امامؒ کی پوری تقریر راوی کو یاد رہ جاتی تو تعدد ازدواج کے مسئلہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام کا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے آ جاتا اور پہلی صدی تک کے مسلمانوں کے مذاق کی وہ ایک تاریخی شہادت ہوتی جو سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں ان کا بہترین جواب امام کا یہ بیان ہو سکتا تھا اور میرے خیال میں تو جو کچھ راوی کو یاد رہ گیا ہے وہ بھی اس مدعا کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

(امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی طبع اول صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰)

اس طویل عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ ایک سے زیادہ شادیوں کو ناپسند کرتے تھے اور خود علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم بھی تعدد ازدواج کے مخالف تھے۔ علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم کی یہ ضخیم کتاب پہلے ایک مختصر مقالہ کی شکل میں تھی جو الفرقان بریلی میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ الفرقان سے بعض دوسرے رسائل نے بھی یہ مضمون نقل کیا۔ اور خصوصاً مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے طویل پیش لفظ کے ساتھ ترجمان القرآن میں بھی اسے نقل کیا تھا۔ پھر غالباً یہ کتاب سنہ ۱۹۴۹ء میں طبع بھی ہو چکی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک علمائے کرام نے اس کتاب کی مندرجہ بالا عبارت کے خلاف کچھ نہ کہا۔ تکلف برطرف کیا اسے اجماع سکوتی نہیں کہہ سکتے۔ خیر جو کچھ بھی ہو بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امام صاحب نے تعدد ازدواج کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اور علامہ مناظر احسن گیلانی بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ بلکہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تعدد ازدواج کو برائی سمجھنے کا تخیل مغرب سے درآمد کیا گیا ہے ان کے اعتراض کا جواب بھی علامہ مرحوم نے دے دیا ہے۔

اب آیئے اصل سوال کی طرف، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے تعدد ازدواج کی حوصلہ افزائی کی ہے ہرگز نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ تعدد ازدواج کی حوصلہ افزائی کرتا تو صاف الفاظ ہوتے کہ "مسلمانو! خوب شادیاں کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تعدد ازدواج کو پسند کرتا ہے" ایسا کوئی حکم کتاب وسنت میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اس کے برخلاف قرآن حکیم تعدد ازدواج پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً ۔

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو۔ دو دو تین تین چار چار۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک بیوی رکھو۔

یعنی اگر یتیموں کا مسئلہ درپیش ہو تو چار تک شادیاں کی جا سکتی ہیں۔ دوسری جگہ یہ بھی کہا ہے کہ عورت کا نان ونفقہ مرد پر فرض ہے یعنی اگر ان اخراجات کا تحمل نہ ہو تو پھر ایک شادی سے بھی احتراز ہی بہتر ہے۔ ان تمام چیزوں کو مدِ نظر رکھ کر سوچئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن تعددِ ازدواج کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اور صرف خاص حالات میں اس کی اجازت دیتا ہے۔

تمام عالم اسلام اس بات پر متفق ہے کہ تعدد ازدواج فرض اور واجب نہیں بلکہ صرف مباح ہے۔ معاشرتی مصلحتوں کے تحت حکومت کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ کسی مباح پر پابندی عائد کر دے۔ اگر حکومت دعوت ولیمہ

پر پچاس آدمیوں سے زیادہ نہ ہونے کی پابندی لگا سکتی ہے۔ تو اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ تعداد ازدواج کی اس وقت تک اجازت نہ دے جب تک اس کی واقعی ضرورت ثابت نہ کر دی جائے اس قسم کی پابندی میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً کے حکم کے بعد اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے "ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا" امام شافعیؒ نے اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں "یہ زیادہ تر قرین مصلحت ہے تاکہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے" ان معانی سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے تعدد ازدواج کی اجازت صرف اس صورت میں دی جا سکتی ہے جب (i) یتیموں کا معاملہ درپیش ہو (ii) عدل کی شرط پوری کی جا سکے اور (iii) معاشی حالات اس کی اجازت دیں۔ علاوہ ازیں اگر اس آیت میں اَلَّا تَعُوْلُوْا کے وہی معنی لئے جائیں جو عام طور پر لئے جاتے ہیں یعنی تم حق سے تجاوز نہ ہو جاؤ۔ تب بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ایک شادی کو ترجیح دے رہا ہے۔ کیونکہ دو سے انسان کو یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے اور حق سے تجاوز نہ ہو جائے ان تمام دلائل پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کسی مصلحت و ضرورت کے مطابق ہی دوسری شادی کی جا سکتی ہے اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ جو شخص دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اس کی ضرورت جائز ہے۔ لازماً اس معاملہ میں کسی کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے گا۔ اور حکومت نے یہی تو کیا ہے۔ اگر مرد محض لذت نفس کے لئے شادیاں رچاتا پھرے تو کیا یہ عورتوں کی اور خود شریعت ربانی کی توہین نہیں۔

آیہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو) کے سلسلہ میں یہ دقیق نکتہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ تو دوسری شادی کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے کہ مرد عدل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے دوسری شادی سے پہلے اس شرط کا عائد کرنا غلط ہے۔

آپ ذرا اصل آیت پر نظر ڈال کر اس کے ساتھ لکھے ہوئے ترجمہ کو بھی پڑھ لیجئے۔ اور پھر سوچئے کہ عدل کا سوال خدا پہلے کر رہا ہے یا بعد میں؟ یہ آیت تصریح کر رہی ہے کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی بیوی رہنے دو زائد بیویوں سے نکاح نہ کرو۔ حکم یہ نہیں کہ پہلے چار شادیاں کر ڈالو اور جب دیکھو کہ عدل نہیں ہو سکتا تو ایک کو رہنے دو اور باقی تین کو طلاق دے دو۔ حکم یہ ہے کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتیموں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو پھر چار تک شادیاں کر سکتے ہو ہاں اگر یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک شادی ہی کافی ہے۔

تعدد ازدواج کے مسئلہ میں علماء کے باقی جتنے اعتراضات بھی ہیں ان کے جواب میں ہم صرف ایک حدیث پیش کئے دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام بخاریؒ باب ذب الرجل عن ابنتہ فی الغیرۃ والانصاف (غیرت اور انصاف

کے بارے میں انسان کا اپنی بیٹی کی طرف سے مدافعت کرنا) کے تحت لائے ہیں۔

عن المسور بن مخرمہ قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول و هو علی المنبر ان بنی هشام بن المغیرہ استاذنوا ان ینکحوا ابنتهم علی بن ابی طالب فلا اذن ثم لا اذن ثم لا اذن الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی و ینکح ابنتهم فانما هی بضعة منی یریبنی ما ارابها و یؤذینی ما اذاها۔

(کتاب النکاح۔ بخاری شریف جلد دوم)

..... سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے نبی صلعم کو منبر پر یہ فرماتے سنا۔ بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی حضرت علی سے کردیں پس میں اجازت نہیں دیتا۔ کوئی اجازت نہیں۔ کوئی اجازت نہیں، ہاں اگر ابوطالب کا بیٹا شادی کرنا چاہتا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دے دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کرلے۔ فاطمہؓ میرے دل کا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی تکلیف پہنچاتی ہے۔ اور جو اسے ایذا دیتی ہے وہ مجھے بھی ایذا دیتی ہے۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) دوسری شادی کے لئے نبی صلعم سے اجازت مانگی گئی۔

(۲) آپ نے پھر اپنے فیصلہ کا اعلان منبر پر فرمایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ آپ امت کو اس کی تعلیم دے رہے تھے۔

(۳) دوسری شادی سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو ایذا پہنچتی۔ معلوم ہوا کہ عام حالات میں دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو ایذا پہنچنا ایک طبعی امر ہے۔ اگر اس وجہ سے پہلی بیوی یا اس کے متعلقین نکاح سے مانع ہوں تو وہ حق بجانب ہیں۔

(۴) جس طرح نبی صلعم کو بیٹی پر سوکن آنے سے تکلیف ہوسکتی تھی اسی طرح ہر باپ کو تکلیف ہوسکتی ہے اور جس طرح نبی صلعم نے یہ برداشت نہیں کیا کہ ان کی بیٹی پر سوکن آئے اسی طرح ہر والد کے لئے یہ چیز ناقابل برداشت ہے۔

(۵) رسول خدا صلعم کی ایک حیثیت امیرالمومنین کی بھی تھی اس سے ثابت ہوا کہ حکومت بھی دوسری

شادی کے معاملہ میں دخل دے سکتی ہے۔

معلوم نہیں تعدد ازدواج کو غیر مشروط سمجھنے والوں کو خود نبی صلعم کا یہ طرز عمل کیوں نظر نہیں آتا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی کی شرط ناگزیر ہے۔ حالانکہ عائلی قوانین اسے ناگزیر بھی قرار نہیں دیتے۔

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اگر دوسری شادی پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر کی جائے تو اس بات کو خلع کے لئے وجہ جواز کیوں قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک شرعی حیثیت یہ ہے کہ اگر ایک عورت ان حالات کے تحت اس قسم کے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرانا چاہے تو اسے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

دیکھئے! اس باب میں خود یہ حضرات کیا کہتے ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "شریعِ اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ نباہ نہیں کر سکتا اسے طلاق دے دے۔ اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر نہ کر سکتی ہو اس سے خلع حاصل کر لے۔"
>
> (حقوق الزوجین طبع ششم ص۶۰)

احادیث میں تو معمولی معمولی باتوں پر عورتوں کے خلع حاصل کرنے کے واقعات ملتے ہیں۔ ثابت بن قیسؓ سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت ابی بن سلول کا قصہ ہے کہ انہیں ثابتؓ کی صورت ناپسند تھی انہوں نے نبی صلعم کے سامنے یہ الفاظ کہے۔

> یا رسول اللہ لا یجمع راسی وراسہ شیئ ابدا انی رفعت جانب الخباء فرایتہ اقبل فی عدۃ فاذا ھو اشدھم سواد واقصرھم قامۃ واقبحھم وجھا ... واللہ ما کرھت منہ دیناً ولا خلقاً الا انی کرھت دمامتہ (ابن جریر)
>
> اے اللہ کے رسول میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز جمع نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا گھونگھٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان میں سب سے زیادہ کالا اور سب سے زیادہ پستہ قد اور سب سے زیادہ بدصورت تھا۔ واللہ میں دین و اخلاق کی کسی خرابی کے باعث اسے ناپسند نہیں کرتی۔ مجھے اس کی

بدصورتی سے نفرت ہے۔

ایک اور جگہ یہ الفاظ ہیں:۔

واللہ لولا مخافۃ اللہ اذا دخل علی لبصقت فی وجھہ ـــــ (ابن جریر)

واللہ! اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا تھا اس وقت میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔

مسند عبدالرزاق میں ہے کہ جمیلہ نے کہا۔

یا رسول اللہ بی من الجمال ما تری و ثابت رجل دمیم (مسند عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری)

اے اللہ کے رسول میں جیسی خوبصورت ہوں آپ دیکھتے ہیں مگر ثابت ایک بدصورت شخص ہے۔

اس طرح جمیلہ نے خلع حاصل کیا۔ ثابتؓ کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں۔ ابن ماجہ کے بیان کے مطابق انھوں نے بھی ثابتؓ کی بدصورتی کی وجہ سے خلع حاصل کیا تھا۔

کیا علمائے کرام توضیح فرمائیں گے کہ اگر محض خاوند کی بدصورتی خلع کیلئے وجہ جواز بن سکتی ہے۔ تو دوسری شادی کیوں وجہ جواز نہیں ہو سکتی؟

علماء نے تعدد ازدواج پر اعتراضات کے سلسلے میں نبی صلعم کے کثیر الازدواج ہونے کو بار بار بطور دلیل بیان کیا ہے۔ حالانکہ رسولؐ خدا کی شادیوں میں وہ کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ شادیاں محض جنسی تسکین کے لئے ہوئی تھیں۔ آپ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور جوانی کا یہ سارا زمانہ بالکل بے داغ رہا۔ آپؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ۴۰ سالہ بیوہ سے شادی کی اور جب تک یہ رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ زندہ رہیں آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ وہ بہت عمر رسیدہ ہو چکی تھیں اور آپ کے ہاں کوئی نرینہ اولاد بھی نہیں تھی۔ جو لڑکے پیدا ہوئے تھے وہ فوت ہو چکے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوا آپ نے جتنی شادیاں کی ہیں وہ تمام ایسی عورتوں سے جو کئی کئی بار کی بیوہ یا مطلقہ تھیں۔ یہ تمام نکاح ہنگامی حالات میں ہوئے باقی رہا یہ امر کہ ان شادیوں میں پہلی ازواج کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ پہلی بیویاں ہر آنے والی بیوی کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتی تھیں اور اسے مبارکباد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی

کے خلاف ہوئی ہوتیں تو وہ کبھی اس خوشی سے خیر مقدم نہ کرتیں۔

کچھ بھی ہو بہر حال قرآن حکیم نے تعدد ازدواج کی اجازت کو - فان خفتم الا تقسطوا فی الیتٰمیٰ - سے مشروط کیا ہے۔ کھلی چھٹی کہیں نہیں دی گئی۔

دفعہ نمبر ۷۔ طلاق کے احکام

طلاق کے متعلق سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ فرض یا واجب نہیں بلکہ صرف مباح ہے اور مباح بھی ایسا کہ اسلام اس کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تمہیں ناپسند بھی ہو تو حتی الامکان اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔

وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (۴/۱۹)

ان کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو اگر وہ تم کو ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

نبی صلعم کا ارشاد ہے۔

ابغض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق -

اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق[1] ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

تزوجو ولا تطلقو فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات

شادیاں کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے۔ جن کے تحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ اور پھر یک لخت چھوڑ دینا بھی درست نہیں۔ ان تصریحات سے بھی

---

[1] یعنی اگر اسے مذاق سمجھ لیا جائے تو (طلوع اسلام)

ثابت ہوتا ہے کہ اسلام بالعموم طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر لوگ ان شرائط کو ملحوظ نہ رکھتے ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ مناسب پابندیاں عائد کرے تاکہ طلاق کے امکانات رُک جائیں یا کم ہو سکیں۔

قرآن کریم نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ ہدایت دی ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف رونما ہو جائے تو یہ نہیں کہ مرد جھٹ غصہ میں آکر تین طلاق کہہ ڈالے بلکہ

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ط (۴/۳۵)

اگر تم کو میاں بیوی میں باہمی اختلاف کا خدشہ محسوس ہو تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے اگر انہوں نے ایسا کیا تو اللہ دونوں میں موافقت پیدا کر دے گا۔

یہاں دیکھئے کہ میاں بیوی کا تذکرہ غائب کی ضمیروں سے کیا گیا ہے۔ اور ان کے باہمی اختلاف پر دو ثالثی ممبر مقرر کرنے کا حکم مخاطب کو دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں مخاطب خود حکومت ہے۔ مروجہ عائلی قوانین میں بھی بالکل اسی قرآنی حکم پر عمل کیا گیا ہے۔

"چیئرمین... صلح صفائی کی غرض سے ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا جس میں فریقین کے نمائندے شامل ہوں گے۔ (مسلم خاندانی قوانین ص۶)

قرآن حکیم کی آیت اور عائلی قوانین کی عبارت میں آپ کو ذرا بھی اختلاف نظر نہیں آئے گا لیکن اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن نے صرف دونوں خاندانوں کے نمائندوں پر مشتمل ثالثی بورڈ کا کہا ہے لیکن عائلی قوانین میں یونین کونسل کے چیئرمین کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اگر قرآن صرف دو خاندانوں کے ایک ایک حکم کی قید ہی لگاتا ہے تو پھر وَاِنْ خِفْتُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو) اور فَابْعَثُوْا (تو حکم مقرر کرو) کا تخاطب کس سے ہے۔ کون یہ حکم مقرر کرے گا؟ قرآن حکیم میں دوسری جگہ خلع کے تذکرہ میں ارشاد ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۔

جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے۔

اس آیت میں بھی میاں بیوی کا تذکرہ مذکورہ بالا آیت کی طرح غائب کی ضمیروں سے کیا گیا ہے اور

فَاِنْ خِفْتُمْ مخاطب کا صیغہ ہے ؛ یہ مخاطب کس سے ہے ؛ ہم سے نہ پوچھئے۔ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے پوچھئے جوان قوانین کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ مولانا موصوف رقمطراز ہیں۔

"اس آیت میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اولی الامر ہی کی طرف ہے"

(حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۶۴)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے .... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ حضرات مخالفت کے جوش میں دانستہ غلط بیانی کرتے ہیں اور یا پھر "مسلم خاندانی قوانین" کو پڑھے بغیر اس پر اعتراض کرنے لگ گئے ہیں اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اگر یونین کونسل کا چیئرمین غیر مسلم ہو تو کیا وہ بھی اس ثالثی بورڈ کا ممبر ہوگا ؟ حالانکہ عائلی قوانین میں یہ صراحت موجود ہے کہ

"غیر مسلم چیئرمین کی صورت میں کونسل اس فیصلہ کی غرض سے کسی مسلمان ممبر کو صدر منتخب کرے گی۔" (مسلم خاندانی قوانین صفحہ ۔۔)

عائلی قوانین میں کوشش کی گئی ہے کہ طلاق جیسی ابغض المباحات چیز کو حتی الامکان روکا جائے۔ علماء سمجھتے ہیں کہ طلاق کا اختیار مرد سے چھین کر چیئرمین کو دے دیا گیا ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ طلاق کا حق مرد سے چھینا نہیں گیا۔ بلکہ وہ حق اب بھی مردوں کے اختیار میں ہے۔ خاندانی قوانین میں کہا یہ گیا ہے کہ

"اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہو تو طلاق کا اعلان کرنے کے بعد اس یونین کونسل کے چیئرمین کو تحریری طور پر نوٹس دے گا جس کے علاقہ میں اس کی بیوی رہتی ہے اس نوٹس کی ایک نقل وہ اپنی بیوی کو بھی مہیا کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے تو وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ (ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں) چیئرمین نوٹس موصول ہونے پر تیس دن کے اندر اندر صلح صفائی کی غرض سے ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا۔ جس میں فریقین کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اگر اس کونسل کی تمام کوششوں کے باوجود فریقین میں صلح صفائی نہ ہو سکے تو مقررہ ضابطے کے مطابق ۹۰ دن کی عدت کے بعد طلاق موثر ہوگی۔" (مسلم خاندانی قوانین صفحہ ۔۔)

علماء اس بات پر بار بار اعتراض کرتے ہیں کہ طلاق کا حق "مرد کو حاصل ہے۔ حکومت کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے اس واقعہ کو لیجئے جسے قرآن حکیم میں ابد تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ حضرت زیدؓ طلاق دینا چاہتے ہیں لیکن نبی صلعم کوشش کرتے ہیں کہ زید طلاق

نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ ۔

اور جب آپؐ اس شخص کو کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے انعام کیا۔ اور آپؐ نے بھی جس پر احسان کیا کہ تو اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور اللہ سے ڈر۔

کیا رسولِ خدا صلعم ایک امیرالمومنین کی حیثیت سے زیدؓ کے فیصلۂ طلاق میں مداخلت نہیں کر رہے؟ علاوہ ازیں خود فقہ حنفی کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حکومت ہی بعض اوقات تفریق کرا دیتی ہے اور مرد کا حقِ طلاق ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ فقہ حنفی کا مشہور مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹی گواہی پیش کرے کہ فلاں مرد نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے تو قاضی ان میں تفریق کرا سکتا ہے۔

لو قضیٰ بالطلاق بشھادۃ الزور مع علمھا حل لھا التزوج باٰخر بعد العدۃ و حل للشاھد تزوجھا وحرمت علی الاول۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ صـــ ۱۰۲)

اگر قاضی نے جھوٹی گواہی پر طلاق دلا دی یہ جانتے ہوئے کہ گواہی جھوٹی ہے تو وہ عورت عدت کے خاتمہ پر دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور گواہ بھی اس سے نکاح کر سکتا ہے اور وہ اپنے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے۔

دیکھئے یہاں مرد طلاق نہیں دیتا۔ محض جھوٹی گواہی سے قاضی عورت کو مطلقہ قرار دے رہا ہے۔

اسی طرح طلاق مکرہ کی صورت ہے کہ کوئی اگر ظلم و جور سے کسی کو مجبور کرے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے۔ پس اگر وہ شخص مجبور ہو کر منہ سے طلاق کا لفظ کہہ دیتا ہے تو فقہ حنفی کے نزدیک طلاق واقع ہو گئی۔

وطلاق المکرہ واقع (ہدایہ اولین صـ ۳۲۸)

طلاق مکرہ واقع ہو جاتی ہے۔

ائمہ ثلاثہ ایسی طلاق کو واقع نہیں سمجھتے۔ لیکن فقہ حنفی میں اسے واقع سمجھا جاتا ہے۔

قالوا الطلاق المکرہ یقع خلافاً لائمۃ الثلاثۃ فلو اکرہ شخص اٰخر علی تطلیق زوجتہ بالضرب والسجن اواخذ المال وقع طلاقہ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ صـ ۲۹۴)

حنفیہ کے نزدیک طلاق مکرہ واقع ہو جاتی ہے اور باقی تینوں ائمہ کے نزدیک واقع نہیں ہوتی۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شوہر کو مار کر یا قید کر کے یا مال چھین کر طلاق پر مجبور کیا جائے تو یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

علاوہ ازیں جب عورت خلع لینی چاہے اور مرد طلاق پر راضی نہ ہو تو قاضی تفریق کرا سکتا ہے۔ فقہ میں اور بھی متعدد جزئیات ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کرا دے۔ پس یہ کہنا کہ طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے اور کوئی اس میں مداخلت نہیں کر سکتا حقیقت کے خلاف ہے جیسا کہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے تو اگر غنڈے کسی شخص کو مجبور کر کے طلاق کے الفاظ کہلوا دیں تو بھی عورت مطلقہ ہو جاتی ہے۔

دفعہ نمبر۔ نکاح کی عمر

عائلی قوانین میں نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس سوال نے ایک قانونی شکل اختیار کر لی ہے اس لئے اس کا تعین بھی کر دیا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے بلوغت کی عمر کیا تصور کی جائے گی۔ علماء حضرات کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید نے نکاح صغیرہ کو بھی جائز قرار دیا ہے اس کی تائید میں وہ سورہ طلاق کی آیت نمبر ۴ کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جن عورتوں کا حیض آنا بند ہو چکا ہو یا جنہیں ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو ان کی عدت یوں ہے۔

سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۴ کے الفاظ ہیں وَاللّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ۔ اردو میں قرآن کے متعدد ترجمے چھپے ہیں کوئی اٹھائیے اور دیکھئے کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ لکھا ہے کہ "جن عورتوں کو حیض آنا شروع نہ ہوا ہو" اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جن عورتوں کو حیض نہ آ سکا ہو۔

اب آپ قرآن مجید کی طرف آیئے۔

(۱) قرآن حکیم نے نکاح کو (میثاقاً غلیظاً (۴/۲۱)) یعنی پختہ معاہدہ کہا ہے۔ معاہدہ کے لئے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں۔

(۲) قرآن حکیم نے بلوغت کو ہی نکاح کی عمر قرار دیا ہے۔

وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ۔ (۴/۶)

(یتیموں کے سرپرست بنو تو مال ان کے حوالے کرنے کے لئے) ان کی پرکھ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔

تمام فقہا و ائمہ تفسیر اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں نکاح کی عمر سے بلوغ مراد ہے۔ یعنی یتیموں کو اس وقت ان کا مال دینا چاہیئے جب وہ بالغ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم بلوغ کو ہی نکاح کی عمر قرار دیتا ہے۔

(۳) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے "فانکحوا ما طاب لکم من النساء" (تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں) اور عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے "لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا" (تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔) لہٰذا جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں وہ نکاح قرآن کی رو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

عام طور پر ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی شادی ۹ سال کی عمر میں ہوئی تھی اور اسی ایک واقعہ کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر یہ واقعہ ہی غلط ہے۔ حضرت اسماء بنت ابو بکرؓ حضرت عائشہؓ کی بڑی (علاتی) بہن تھیں ان کے متعلق صاحب مشکوٰۃ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب اپنی مستند کتاب اکمال فی اسماء الرجال میں لکھتے ہیں۔

"یہ اسماء ہیں ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی۔ ان کو ذات النطاقین کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے جس رات میں حضورؐ نے ہجرت کی تھی اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے اس کے ایک حصہ میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزہ پر باندھا۔ یا اس کا پٹکا بنا لیا تھا اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ہیں۔ مکہ میں اسلام لائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سترہ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور یہ حضرت عائشہؓ سے دس برس بڑی تھیں..... ایک سو سال کی عمر میں انتقال کیا اس وقت ۷۳ھ تھا ان سے بہت سے لوگوں نے احادیث روایت کی ہیں۔" (اکمال فی اسماء الرجال)

بوقت وفات (۷۳ھ میں) سو سال کی تھیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کی عمر ہجرت کے وقت ستائیس سال کی تھی۔ حضرت عائشہؓ ان سے دس برس چھوٹی تھیں۔ ——— اس لئے حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ سال ہوگی۔ شادی ۲ھ میں ہوئی تھی۔ اس لئے شادی کے وقت ان کی عمر انیس سال تھی۔

ان تصریحات کو مدّنظر رکھیے تو وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ کے یہ معنی ہوں گے کہ جو عورتیں بالغ تو ہیں مگر انہیں کسی وجہ سے حیض نہیں آیا۔

ظاہر ہے کہ قرآن حکیم نے کسی طرح بھی صغیرسنی کے نکاح کی حمایت نہیں کی شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں۔

یقول ابن شبرمہ وابوبکر الاصم انہ لا یزوج الصغیر والصغیرۃ حتّٰی یبلغا لقولہ تعالٰی حتّٰی اذا بلغوا النکاح فلو جاز التزویج قبل البلوغ لم یکن لھٰذا فائدۃ۔

(المبسوط ج ۴ صـ ۱۹۳)

امام ابن شبرمہ اور ابوبکر اصم نے نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کی شادی کی مخالفت کی ہے۔ ان کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۔ اگر بلوغت سے پہلے نکاح جائز ہوتا تو یہ آیت بے سود تھی۔

امام ابن شبرمہؒ کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں کہ وہ بھی صاحبِ مذہب تھے۔ علامہ مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ۔

"ابن شبرمہ بھی اپنے وقت کے ممتاز آدمی تھے۔ دین میں بھی اور علم میں بھی۔ دین کا حال تو ان کے طبقات ہی میں یہ لکھا ہے کہ یمن کے والی بنا کر شروع شروع میں بھیجے گئے تھے۔ کچھ دن سے اس کے بعد معزول ہو گئے۔ معمر جو یمن کے مشہور محدث ہیں ان کا بیان ہے کہ رخصت کرنے کے لئے میں ان کے ساتھ ذرا دور تک چلا گیا۔ جب سب لوگ چھٹ گئے اور تنہا میں ہی رہ گیا تو فرمایا۔ بھائی خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ اگرچہ میں یہاں کا والی تھا لیکن جس کپڑے کو پہن کر آیا تھا وہی پہنے ہوئے واپس جا رہا ہوں۔ معمر کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر چپ ہو گئے پھر بولے یہ حلال کے متعلق ذکر کر رہا ہوں اور حرام کی تو خیر گنجائش ہی کیا تھی"

(امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی صـ ۲۹۰ بحوالہ طبقات ابن سعد ج ۶ صـ ۲۴۴)

علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

" وفیھا (۱۴۴ھ) توفی فقیہ الکوفۃ ابو شبرمۃ عبد اللہ ابن شبرمۃ الضبی القاضی روی عن انسؓ والتابعین "

سنہ ۱۴۴ھ میں کوفہ کے فقیہ قاضی ابوشبرمہ عبداللہ بن شبرمہ فوت ہوئے
وہ انسؓ اور تابعین سے روایت کرتے تھے۔ (العبر فی خبر من غبر صفحہ ۱۹۷)
یہی عبداللہ بن شبرمہ ہیں جنہوں نے شادی کے لئے ۱۸ سال اور ۱۶ سال کی شرط مقرر کی تھی۔ علامہ مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔

"علم میں ان کا خاص درجہ تھا انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کی عمر متعین کر دی تھی یعنی ۱۸ سال لڑکے کی اور ۱۶ سال لڑکی کی عمر شادی کے وقت ہونی چاہیئے۔ مصری گورنمنٹ نے جدید شرعی قوانین علمائے مصر سے چند سال پیشتر مدون کرایا تھا جس میں ابن شبرمہ کے اس فتویٰ کو قانون کی حیثیت عطا کی گئی تھی"

(امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی صفحہ ۲۹ بحوالہ القضاء فی الاسلام صفحہ ۲۶)

یہ مصر کا قانون وہ ہے جس کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔

"مصر میں جب (MIXED TRIBUNALS.) قائم کئے گئے تھے تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ حکومت مصر کے ایما سے قدری پاشا کی صدارت میں علمائے ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا۔ اور مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا ہے"

(حقوق الزوجین صفحہ ۹)

یعنی وہی قانون جب مصر میں رائج تھے تو نہایت مستند ماخذ سے مرتب کئے گئے تھے اور ویسے ہی قوانین جب پاکستان میں نافذ ہوئے تو خلاف اسلام قرار پا گئے۔ ع

ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہئے

قرآن کی رو سے جب بلوغ کو شادی کے لئے شرط قرار دے دیا گیا تو ہر ملک میں حکومت ڈاکٹروں سے رائے لے کر بلوغ کی عمر متعین کر سکتی ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کوئی مرد کہے میری بیٹی بالغ ہے اور اس وقت تحقیق ہوتی پھرے کہ آیا وہ بالغ ہے یا نہیں۔ اسی لئے امام اعظمؒ نے بھی بلوغ کی عمر مقرر کر دی تھی۔ شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:-

واما بلوغها بالسن فعند ابو حنيفة رحمة الله تعالى

فی الجاریۃ بسبع عشرۃ سنۃ و فی الغلام تسع عشرۃ سنۃ " (المبسوط ج ۶ ص ۵۳)

بلوغ کی عمر امام ابو حنیفہ کے اندازہ کے مطابق لڑکے کے لئے ۱۹ سال اور لڑکی کے لئے ۱۷ سال ہے۔

پس اگر یہاں گورنمنٹ نے ۱۶ اور ۱۸ سال کی قید لگا دی تو کون سا خلاف اسلام فعل سرزد ہو گیا۔

ہم مذکورہ بالا تمام بحث کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ کم سنی کی شادی جائز ہے لیکن پھر بھی آپ اسے جائز ہی کہیں گے۔ فرض اور واجب تو نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مباح کے متعلق خود علماء بھی تسلیم کریں گے کہ یہ ہمت افزائی کا مستحق نہیں اور یہ مباح قباحتیں پیدا کر سکتا ہے پس اگر حکومت نے اس کی ہمت شکنی کر دی تو کون سا خلاف اسلام فعل صادر ہو گیا۔؟

آخر میں ہم علمائے کرام سے درخواست کریں گے کہ وہ ان قوانین پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور سوچیں کہ ان میں وہ کون سی بات اسلام کے خلاف ہے جس کی وجہ سے ان کی اس قدر مخالفت کی جا رہی ہے۔

صحیح اسلام سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کا لٹریچر دیکھئے

اس کی تفصیل کے لئے ایک کارڈ ذیل کے پتہ پر بھیج دیجئے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب

(اقبالؒ)

احتساب

تحریکِ پاکستان کا فاتحانہ انجام، طلوعِ اسلام کے نزدیک ملت کی مقدس ترین آرزو کی بجا آوری کا حرفِ آغاز تھا۔ دورانِ تحریک میں وہ اس کے مخالفین سے ڈٹ کر لڑا اور حصولِ پاکستان کے بعد کار فرمایانِ مملکت کے غلط اقدامات کے خلاف اس کے قلمی جہاد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ "احتساب" کے عنوان سے اسی سلسلۂ تنقید کی کچھ جھلکیاں قارئین کے سامنے لائی جا رہی ہیں اور یہ اسی کی چھٹی قسط ہے ——— ادارہ

۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل پاکستان نے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیتے ہوئے مجلس دستور ساز کو ختم کر دیا، اور مملکتِ پاکستان ہنگامی صورتِ حال سے دوچار ہو گئی۔ فیڈرل کورٹ کے فیصلوں کے بعد گورنر جنرل نے دستورِ مملکت کی از سرِ نو تسوید اور وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے لئے انتظامی اقدامات کا آغاز کیا۔ پاکستان اپنی زندگی کے ایک نئے اور نازک موڑ میں داخل ہو رہا تھا۔ اور "طلوعِ اسلام" کو ان عظیم ذمہ داریوں کا بخوبی احساس تھا جو قرآنی فکر کے نقیب اور داعیٔ انقلاب کی حیثیت سے اس پر عائد ہو رہی تھیں چنانچہ "ہنگامی حالات کے بعد" کے عنوان سے اس نے اپنی ۹ر اپریل ۱۹۵۵ء کی ہفتہ وار اشاعت میں جو افتتاحیہ سپردِ قلم کیا اس میں وحدتِ مغربی پاکستان کی تحریک کی حمایت کرتے ہوئے لکھا:۔

وحدتِ مغربی پاکستان

"ہمارا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ فلاں فلاں صوبہ ہمیں دے دو۔ مطالبہ یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان سے الگ کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حتیٰ کہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں سے بھی ہمیں وہی علاقہ ملا جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس سے واضح ہے کہ صوبوں کی لکیریں پاکستان کے مطالبہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ لیکن اربابِ سیاست کی

اغراض مشئومہ نے ملت پر ان علاقائی لکیروں کو مقدم بنا دیا۔ اور صوبوں کی انتظامی حدبندیوں کو قلوب و اذہان میں اس طرح جاگزیں کر دیا کہ ایک ملت کہلانے والے مسلمان اپنے آپ کو سندھی، بنگالی، پنجابی، پٹھان اور کیا کیا کچھ کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ نسلی اور صوبائی تعصب کی یہی آگ تھی جس نے سارے پاکستان کو جہنم میں تبدیل کر دیا اور آئین کی تسوید کو جو آزاد و مہذب ملک کا پہلا لازمہ ہوتا ہے "الجھا الجھا کر بھول بھلیاں بنا دیا۔ .... ہم نے بارہا یہ لکھا ہے کہ جغرافیائی یا انتظامی حدبندیاں سہولت یا تعارف کی غرض سے ہوتی ہیں لیکن اگر وہ یہاں تک دل نشین ہو جائیں کہ دلوں میں بھی حدبندیاں قائم ہو جائیں اور قوم ان اضافی نسبتوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے تو یہی حدبندیاں انتہائی مذموم ہو جاتی ہیں۔ اور اس قابل کہ انہیں حرف غلط کی طرح محو کر دیا جائے۔ پاکستان میں تخریبی عناصر نے ان لکیروں کو خوب اچھالا ہے اور ان کے نام پر جسد سیاست میں بڑا خطرناک زہر داخل کر دیا ہے۔" (طلوع اسلام۔ ۹/اپریل ۵۵ء صفحہ ۳-۴)

مجرمانہ تغافل انہی ایام میں کابل کے پاکستانی سفارت خانے کے خلاف اشتعال انگیزی سے کام لیا گیا۔ اور غنڈہ گردی کی انتہائیں ہوئی کہ کابلی حکمرانوں کی شہ پر نہ صرف سفارتخانے پر منظم حملہ کیا گیا بلکہ جھنڈا تک پھاڑ دیا گیا۔ طلوع اسلام نے "کابل کی اشتعال انگیزی" کے زیر عنوان حکومت پاکستان کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ــــ

"ہمیں افسوس ہے کہ ہماری حکومت نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔ ہمارے نمائندے جو کابل میں متعین ہوتے رہے وہ عموماً پبلک میں یہی بیان دیتے رہے ہیں کہ افغانستان سے ہمارے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں اور اب یوں ہو جائے گا اور یوں ہو جائے گا۔ خود موجودہ سفیر کرنل شاہ نے بھی اس سلسلہ میں بڑی امیدیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر ہمارے نمائندے اس غلط فہمی میں دیانتداری سے مبتلا رہے ہیں تو یہ ان کی سطح بینی اور کم نظری کا ثبوت ہے۔ اور اگر مصلحتاً انہوں نے قوم کو تصویر کا روشن رخ دکھایا۔ لیکن حکومت کو صحیح حالات سے باخبر رکھا تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ حکومت نے مجرمانہ تغافل سے کام لیا۔ اور بروقت اصلاح احوال کے لئے کچھ نہیں کیا۔ (شمارہ ۹/اپریل ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۶)

خارجہ پالیسی ۱۶/اپریل ۱۹۵۵ء کا طلوع اسلام "پاکستان کی خارجہ پالیسی" کے عنوان سے اہم افتتاحیہ لے کر سامنے آیا۔ اس نے بین الاقوامی واقعات و حقائق کی روشنی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بھرپور جائزہ لیا اس کے ہر گوشے سے نقاب الٹا۔ اس کے نتائج و عواقب کی

جیتی جاگتی تصویر پیش کی۔ اور اس تفصیل کے دوران میں اس تلخ حقیقت کو صاف اور واشگاف انداز میں بایں الفاظ دہرایا کہ۔

سطور بالا سے یہ تشویشناک صورت سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی عالم اسلامی میں کوئی ساکھ نہیں۔ برطانیہ اس کا دوست نہیں۔ امریکہ اس کے حق میں کھلم کھلا ووٹ دینے کے لئے تیار نہیں۔ گویا دنیائے سیاست میں وہ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ اس کی یہ تنہائی ایسے عالم میں ہے کہ روس اور امریکہ جیسے ممالک بھی تنہا رہنے کا تصور نہیں کر سکتے ... کوئی اور ملک اس قدر تنہا ہوتا تو شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا۔ کیونکہ اس سے اس کی بقا معرض خطر میں پڑ جاتی۔ لیکن ہمارے ارباب حکومت یوں مگن ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ تنہائی دوسری قوموں سے ہٹ کر اور علیحدہ رہنے کے باعث نہیں۔ پاکستان تقریباً وہ سب کچھ کرتا رہا ہے جس سے اسے دیگر اقوام کی حمایت اور دوستی میسر آئے۔ لیکن اس کے باوصف نتیجہ وہ نکلا جو اب ہمارے سامنے ہے۔ (شمارہ ۱۶ اپریل ص۴)

ہماری فروگذاشت

ایسا کیوں ہوا؟ یہ ہماری زندگی اور موت سے متعلق اہم ترین سوال تھا طلوع اسلام نے اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے بڑی وضاحت سے لکھا:۔

اس حیثیت سے پہلے ہی دن ہمیں یہ طے کر لینا چاہیئے تھا کہ بین الاقوامی سیاست میں ہمارا کردار کیا ہوگا؟ یعنی ہماری فارن پالیسی کیا ہوگی؟ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور ہوتا بھی کیسے؟ اس کے لئے یہ شعور ضروری تھا کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں۔ اور بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں ان کے حصول کی کون سی مناسب صورت ہے۔ اگر مقاصد واضح طور پر ہمارے سامنے ہوتے تو وہ ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیتے کہ عالمی بساط پر کون ہمارے دوست ہیں۔ ان کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے اور ان سے مدد کیسے لی جا سکتی ہے۔ ہم نے فارن پالیسی کا بیل لمبی چوڑی تقریروں کو سمجھ لیا جن میں حق و انصاف۔ انسانیت۔ آزادی وغیرہ بلند اقدار پر خطبے دیئے جاتے تھے۔ دوسری قومیں ہمارے یہ خطبے سنتی تھیں اور سر ہلاتی تھیں کیونکہ ان اقدار سے کسی کو انکار نہیں تھا ... لیکن جب معاملہ رائے شماری کا آتا تو فیصلہ کچھ اور ہوتا تھا اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ آج کل کی آزاد قومیں اقوام متحدہ میں شریک ہیں تو اپنے ملکی مفاد کی خاطر۔ وہ اسی بنا پر دوسری اقوام سے تعاون کرتی ہیں اور اسے بھی

نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ اس کے برعکس پاکستان نے نہ اپنا مفاد متعین کیا، نہ دوسروں کا مفاد سمجھا اور نہ کوئی باہمی تعاون کی شعوری کوشش کی ..... یہ تو غنیمت ہوا کہ اس دوران میں کوئی بین الاقوامی تصادم ایسا نہیں ہوا جس میں قومیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو جاتیں۔ ایسا ہوتا تو ہمیں نظر آجاتا کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں (ایضاً)

حل کیا ہے؟ اس مایوس کن صورت حال کی تفصیل پیش کرنے کے بعد طلوع اسلام پاکستان کی خارجہ پالیسی کے نقوش و خطوط متعین کرتا ہے اور لکھتا ہے۔

نقشے پر دیکھنے سے یہ حقیقت بآسانی سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کے قدرتی دوست وہ مسلمان ممالک ہیں جن کا سلسلہ مغربی پاکستان سے شروع ہو کر ایک طرف ترکی تک جاتا ہے اور دوسری طرف سویز کو عبور کرتا ہوا مغرب اقصیٰ کے انتہائی کونوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ علاقے پاکستان سے ملحق بھی ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے باشندوں کے درمیان گہرے قلبی روابط ہیں۔

اس نشان دہی کے بعد وہ مسلم ممالک کی داخلی سیاسیات اور پاکستان دشمن ممالک کے پیدا کردہ عوامل کا پورا پورا تجزیہ کرتا ہے۔ اور تفصیلاً بتایا ہے کہ ان ممالک نے پاکستان کے خلاف مسلم ممالک میں کس قسم کا زہریلا پروپیگنڈہ جاری کر رکھا ہے اور دوسری طرف پاکستان کی کیفیت یہ ہے کہ

پاکستان نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس کا کچھ تدارک نہ سوچا۔ جہاں ہندوستان نے اپنے اہل ترین اور عیار ترین نمائندے ان ممالک میں بھیجے وہاں پاکستان نے بڑی غفلت اور بے خردی کا مظاہرہ کیا۔ ہمیں نام لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن گزشتہ آٹھ سالوں میں جو پاکستانی سفیر اسلامی ممالک میں بھیجے گئے انھوں نے فضا کو اور خراب کیا۔ غالباً ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اگر ایک طرف ان نمائندوں میں تدبر کا فقدان اور جذبۂ صحیحہ کا افلاس تھا تو دوسری طرف خود حکومت پاکستان کے سامنے کوئی متعین پالیسی نہیں تھی۔ جس پر ہمارے نمائندے عمل پیرا ہوتے۔ (ایضاً۔ ص۵)

اس کے بعد طلوع اسلام خارجہ پالیسی کی ناکامی کی مثالیں پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ بین الاقوامی اداروں میں ہندوستان اپنے سراسر غلط موقف کی تائید حاصل کر لیتا ہے لیکن حق و صداقت پر مبنی ہونے کے باوجود پاکستان کو امریکہ جیسے دوستوں کی تائید بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے؟ طلوع اسلام اس کے جواب میں حقیقت

کی یوں نقاب کشائی کرتا ہے۔

ہم اسے دُہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ فارن پالیسی محض اعلیٰ اخلاقی یا انسانی اقدار کا واسطہ دے کر اپیلیں کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو موثر بنا کر دوسرے ممالک کی عملی حمایت حاصل کرنے کا نام ہے...... اس پالیسی کا مطلب بین الاقوامی میدان میں معتمد دوست پیدا کرنا ہے۔

پاکستان ایسا نہیں کر سکا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار کو خیرباد کہہ کر دوسروں کی دوستی حاصل کی جائے۔ ہم یقیناً اس انداز سیاست کے کھلے ہوئے دشمن ہیں اور پاکستانی قائدین کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ اپنی پالیسی کو ان اقدار سے علیحدہ کر لیں۔ ہم نے پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا ہے کہ اخلاقی اقدار کی عظمت کو برقرار رکھا جائے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ محض بلند اصولوں کی مالا جپتے رہنے سے سب کچھ حاصل نہ ہو گا۔ (ایضاً)

نمائشیں ہی نمائشیں

پاکستان کے بڑے شہروں اور بالخصوص دارالسلطنت کراچی میں سرکاری طور پر نمائشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع تھا۔ اور یہ ساری رنگ رلیاں اس مملکت میں جاری تھیں جس کے لاکھوں افراد روٹی کپڑے اور رہائش کے لئے مکان تک سے محروم تھے۔ اس مضحکہ خیز صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:-

یوں تو پاکستان کی آٹھ سالہ زندگی کو سمٹا کر سامنے لایا جائے تو اس کی صحیح تعبیر کے لئے ایک لفظ "نمائش" کافی ہو گا۔ علم و حکمت کی اس مہرہ بازی میں بحث و تکرار کی نمائش۔ مکتب و مدرسہ میں پرانے افکار کی نمائش، معاشیات و اقتصادیات میں خطوط خمدار کی نمائش۔ مزید و کجدار کی نمائش۔ سیاسیات میں، ہوس کی خونریزیاں چھپانے کو، عقل عیار کی نمائش......

یہ نمائشیں کیوں قائم کی جا رہی ہیں؟ اس لئے کہ امریکہ میں اس قسم کی نمائش گاہیں قائم ہیں۔ یہ کچھ لکھنے کے بعد طلوع اسلام عوام کے دل کی دھڑکنوں کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے اور لکھتا ہے۔

اگر ہمارے ملک میں کوئی باہوش طبقہ ایسا ہے جس کی آواز ان محلات شاہی میں بسنے والوں کی خوابگاہوں تک پہنچ سکتی ہے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ان حضرات کے کانوں تک زمانہ کی یہ تلخ حقیقت پہنچا دیں کہ بھوکے کا پیٹ روٹی سے بھرتا ہے۔ چولے۔ چھٹے۔ توے پرات کے نقشوں سے نہیں بھرتا۔ قوم ایک ایک پیسے کو ترس رہی ہے۔ لاکھوں انسان زندگی

کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو رہے ہیں۔ اور ہمارے یہ تخیلات کی جنتوں میں بسنے والے ارباب نظم و نسق ہیں کہ لاکھوں روپیہ نمائش گاہوں کی تعمیر پر صرف کرنے کی سوچ رہے ہیں اور سوچ اس لئے رہے ہیں کہ امریکہ میں ایسی نمائش گاہیں بنی ہوئی ہیں " انہیں کون بتائے کہ امریکہ کی دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اسے (دنیا بھر کے گداگروں کی جھولیاں بھرنے کے بعد) لاکھوں من اشیائے خوردنی سمندر میں ڈبونی پڑتی ہیں۔ (شمارہ ۔ ۷ مئی ۱۹۵۵ء ۔ صفحہ ۶)

پاکستان کا دل

قائداعظمؒ نے بارہا پنجاب کو " پاکستان کا دل " قرار دیا تھا لیکن اسی پنجاب میں علاقائی سازشوں کے جو ڈرامے کھیلے گئے اور کھیلے جا رہے تھے اس کی زہرانگیزیوں سے پورے پاکستان کی فضا مسموم ہوئی جا رہی تھی۔ طلوع اسلام ایک عرصہ تک اس ڈرامہ کو بہ لب دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن اس کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں اس نے اپنے جگر سوز افتتاحیے میں دل کے زخم صفحہ قرطاس پر بکھیر دیئے اور لکھا:۔

قائداعظمؒ کی عین حیات ہی میں ارباب سیاست کی خانہ جنگی اس قدر گھناؤنی ہو گئی تھی کہ ان کی مساعیٔ مفاہمت یکسر ناکام ہو گئیں۔ قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد جو دور شروع ہوا اس کا دار و مدار ہی ریشہ دوانی اور سازش پر تھا۔ اس پر پاکستان کے دل پر دورے پر دورے پڑنے شروع ہو گئے۔ اگر آج تک یہ دل حرکت کرتا رہا ہے تو اس کی یہ غیر معمولی سخت جانی کی نشانی ہے۔ مرض کی شدت کی کمی کا ثبوت نہیں۔۔۔۔ برطرف شدہ مجلس دستور ساز نے ایسی بساط بچھائی کہ وزارتوں کے بندے عہدوں کے بھوکے اور ملک کے دشمن اپنے اپنے سروں پر سازشوں کے جالوں کے پشتارے لادے کراچی میں آموجود ہوئے۔ سیاست کی اسٹیج پر سات سال سے جو گھناؤنا ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا یہ اس کی داستان جگر گداز کا انتہائی نقطہ (CLIMAX) تھا۔ مملکت پاکستان سازشوں کے گراں بار بوجھ کے نیچے دب کر دم توڑ رہی تھی اور روح پاکستان زبان حال سے پکار رہی تھی۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل   چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

(افتتاحیہ ـــــ ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء)

مجلس دستور ساز کے خاتمے کے بعد امید کی ایک نئی کرن ابھری۔ وحدت مغربی پاکستان کا منصوبہ ایک صبح بہار کا عنوان بن کر سامنے آیا لیکن جلد ہی یہ تابناک فضا تاریکیوں کی زد میں آگئی۔ طلوع اسلام کے الفاظ میں سنیئے:۔

ملک میں تذبذب کا دور ختم ہوتا جا رہا تھا اور یقین و اتحاد کی فضا پیدا ہو رہی تھی کہ پھر سے مرحب و عنتر اٹھے۔ اس وقت پتہ چلا کہ میدان میں کوئی اسد اللہ نہیں۔ جسے دیکھئے جادوئے سامری کا ہلاک اور شیوۂ آذری کا قتیل۔

اس سے سپیدۂ سحر صبح کاذب میں تبدیل ہوگیا۔ اور پھر سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا سندھ سے آواز اٹھی کہ آئین ساز کنونشن کے لئے صرف سندھی منتخب ہوں گے۔ سرحد نے کہا کہ ہم بھی کسی "باہر" کے غیر سرحدی کا نام نہیں لیں گے۔ یہ وہی اسمبلیاں تھیں جو چند دن پہلے یہ بلند بانگ قراردادیں پاس کر چکی تھیں کہ پاکستان جس مکروہ صوبائیت کا شکار ہے اس کا علاج یہ ہے کہ صوبوں کو یک قلم ختم کر دیا جائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ صوبوں کی حدیں سطح ارض پر نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں تھیں۔ مٹی کی لکیریں مٹا دینے سے دلوں کی لکیریں نہیں مٹ سکتیں۔ اس کے لئے ضرورت تو یہ ہے کہ ان دلوں میں چھری چبھو دی جائے اور اگر پاکستان کو بحیثیت پاکستان باقی رہنا ہے تو ان دلوں میں ہی چھری نہیں چبھونی ہوگی بلکہ جن سینوں میں یہ دل ہیں ان سینوں کو خنجر سے شق کر دینا ہوگا .... ہمارے نزدیک پاکستان کی بقا تمام امور پر مقدم ہے۔ بشرطیکہ ان امور میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہ ہو .... ہماری ملی زندگی کا دارومدار پاکستان کی زندگی پر ہے۔ پاکستان باقی رہا تو ہم بھی باقی رہیں گے اور پاکستان ڈوبا تو ہم بھی غرق ہو جائیں گے۔ اور وزارتوں و عہدوں کی وہ ساری کرسیاں بھی گرداب ہلاکت کی نذر ہو جائیں گی، جن کی خاطر اس وقت کتوں کی طرح لڑائی لڑی جا رہی ہے .... مرکز پر اعتماد کا اظہار کر کے اور وحدت کا نام لے کر ملک اور قوم کو دھوکا دینے والے ننگے ہو کر ناچ رہے ہیں۔ (ایضاً۔ صـ۱۷)

اور اس کے بعد خون کے آنسو برساتے ہوئے طلوع اسلام نے صورت حال پر یوں نوحہ خوانی کی۔

یہ بھی دیکھئے کہ یہ حامیان افتراق و دشمنان وحدت سب کے سب مسلم لیگ کے ارکان ہیں۔ اگر ان میں ملکی شعور اور ملی سلیقہ نہیں تو ساتھ ہی ان میں پارٹی ڈسپلن کا شائبہ تک نہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ان سے اپیل کریں تو کس نام پر اور واسطہ دیں تو کس کا؟ یہ خود سات سال سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلم لیگ قائد اعظم کا مقدس ترکہ ہے۔ لیکن انہیں کیسے بتایا جائے کہ اگر قائد اعظم کی مسلم لیگ پاکستان کو عدم سے وجود

میں لائی تھی تو ان کی مسلم لیگ پاکستان کو وجود سے عدم کی طرف لے جا رہی ہے۔

آج اگر قائداعظم بھی ان اخلاف کو دیکھ لیں تو وہ یقیناً ان سے برأت اور بیزاری کا اعلان کردیں۔ لیکن قائداعظمؒ آنے سے رہے اور یہ اعلان بے تعلقی ہونے سے رہا۔ اس کا پتہ اس وقت چلے گا جب فطرت کے قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا۔ اور ان کی ایک ایک سیہ کاری ان کے سامنے آجائے گی۔ اس وقت آپس میں بیکار باتوں پر لڑنے کو مقصودِ زندگی سمجھنے والے۔ قسطنطنیہ کے یہ پادری" روئیں گے اور کہیں گے۔

یا لیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً (ایضاً)

جس طرح تاج محل آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے۔ جس طرح آج سے تین سو سال پہلے اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اس قسم کی کتابیں محترم پرویز صاحب کی زندۂ جاوید تصانیف

انسان نے کیا سوچا؟ ——— اور

سلیم کے نام خطوط

ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں یہ انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ انسان نے کیا سوچا ——— قیمت ۱۲ روپے
سلیم کے نام خطوط (تین خوبصورت جلدوں میں) جلد اول - آٹھ روپے جلد دوم ۶ روپے جلد سوم - چھ روپے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور